شتمِ رسول کا مسئلہ

قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں

مولانا وحید الدین خاں

Shatm-e-Rasool Ka Masla
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1997
Reprinted 2012
This book is copyright free.

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 9111-4182-7083, 4652-1511
Fax: 9111-4565-1771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com
www.goodword.net

Printed in India

پہلا باب	آغاز کلام	صفحہ	۵
	اسلام مغربی لٹریچر میں		۹
	یہ اسلام نہیں		۲۱
	جہاد یا سرکشی		۲۳
دوسرا باب	رشدی کی کہانی	صفحہ	۲۸
	سورج پر خاک		۳۸
	فرضی افسانہ		۴۱
	غلط بیانی		۴۴
	اطاعت یا سرکشی		۵۰
	حکمت اعراض		۵۸
	دور آزادی		۶۷
	زیادہ بڑی سزا		۷۴
تیسرا باب	قول بلا فعل	صفحہ	۸۰
	متفرقات		۸۵
	ناقابل فہم		۱۰۱
	ابن تیمیہ کی کتاب		۱۰۴
	قیاسی مسئلہ		۱۱۴
	پیغمبر اور مستہزئین		۱۳۲
چوتھا باب	مصلحتِ دعوت	صفحہ	۱۴۰
	پیغمبر کا طریقہ		۱۴۳
	دور اول کی مثال		۱۵۲
	خدائی ضمانت		۱۶۵
پانچواں باب	سوچنے کی بات	صفحہ	۱۷۴
	خاموشی کی طاقت		۱۷۹
	پہلا کام		۱۸۱

پہلا باب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عمر بن عبد العزیز (۱۰۱ - ۶۱ھ) بنو امیہ کے دور کے ایک صالح اور راشد مسلم حکمراں تھے۔ ان کے زمانہ میں اسلام کی بہت اشاعت ہوئی۔ لوگ کثرت سے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عمر بن عبد العزیز نے عمومی حکم جاری کر دیا کہ جو شخص اسلام قبول کرے، اس کے اوپر سے جزیہ کی رقم فوراً ساقط کر دی جائے۔ اس کے نتیجہ میں سرکاری بیت المال کی آمدنی کم ہو گئی۔

یہ اقتصادی نقصان دیکھ کر ایک عامل (گورنر) نے عمر بن عبد العزیز سے کہا کہ جزیہ کی رقم ساقط کرنے کی وجہ سے لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس طرح تو ہمارا بیت المال خالی ہو جائے گا۔ عمر بن عبد العزیز نے کہا کہ تمہارا برا ہو، اللہ نے محمد کو ہدایت دینے والا بنا کر بھیجا ہے، اس نے آپ کو محصّل بنا کر نہیں بھیجا (ان اللہ انما بعث محمدا ھادیًا ولم یبعثہ جابیًا)

عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں ایسے مسلمان بہت تھوڑے ہوں گے جو پیغمبر اسلام کو محصّل Tax-collector سمجھتے ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ میں تو بظاہر تمام مسلمان اسی سوچ کے ہو چکے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کے حالات بتاتے ہیں کہ اصاغر سے لے کر اکابر تک تمام مسلمان دعوت کے شعور سے خالی ہیں۔ عمر بن عبد العزیز کے قول میں جو شعور دعوت تھا وہ شعور دعوت موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، کم از کم ان کے معلوم و ممتاز افراد میں سے کسی میں بھی نہیں پایا جاتا۔

موجودہ زمانہ کے لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں کے پاس مسلمان کی حیثیت کو بتانے کے لیے جو الفاظ ہیں، وہ کیا ہیں۔ وہ ہیں خدائی فوجدار، محتسب کائنات، خلیفۃ اللہ فی الارض، وغیرہ۔ اس قسم کے تمام الفاظ بلاشبہ لغویت کی حد تک غیر اسلامی ہیں۔ قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر) مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے عملاً اس آیت کو الٹ دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارا کام صرف نصیحت اور وعظ کہنا نہیں ہے، بلکہ داروغہ بن کر لوگوں کے اوپر حکمرانی کرنا ہے۔

یہی موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس شعور سے خالی ہو گئے ہیں کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بجائے وہ

اپنے آپ کو زمین پر خدا کا سیاسی نائب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کے گواہ ہیں (وتکونوا شھداء علی الناس) ان کا کام یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی منصوبہ سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ انھیں خود حق پر قائم ہونا ہے، اور لوگوں کے درمیان حق کی پیغام رسانی کرنا ہے۔ اس کے سوا جو امور ہیں، ان سب کو انہیں اللہ کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔

دعوت مومن کی شخصیت کی کلید ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی ان کے تمام خارجی رویہ کو متعین کرتا ہے۔ چونکہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دعوت کے شعور کو کھو دیا ہے، اس لیے ان کا پورا خارجی رویہ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ وہ اسلام کے نام پر ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان نہ صرف یہ کہ دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ مسلسل طور پر دعوت کو قتل کرنے میں مشغول ہیں۔ دوسری قوموں کو سیاسی حریف سمجھنا، ان کے مقابلہ میں احتجاجی اور مطالباتی مہم چلانا، ایسے جھگڑے کھڑے کرنا جس کے نتیجہ میں داعی اور مدعو کے درمیان تعلقات خراب ہو جائیں۔ اس طرح کی تمام سرگرمیاں دعوت کی فضا کو بگاڑتی ہیں۔ وہ دعوت و نصیحت کی قاتل ہیں۔ مگر ساری دنیا کے مسلمان ہر روز انہیں دعوت کُش سرگرمیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ اصاغر تو درکنار، ان کے اکابر بھی یہ سوچ نہیں پاتے کہ ایسا کر کے وہ اپنے خلاف خدا کے غضب کو بھڑکا رہے ہیں۔

انہیں دعوت کُش سرگرمیوں میں سے ایک سرگرمی وہ ہے جو "شتم رسول" کے خلاف مسلمان ہر جگہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ اور جس کا ایک نمایاں مظاہرہ سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) کی اشاعت کے بعد ۱۹۸۹ میں سامنے آیا ہے۔ اینٹی رشدی ایجی ٹیشن بلاشبہ لغویت کی حد تک غیر اسلامی تھا۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کے اصاغر و اکابر کے درمیان اس لیے جاری رہا کہ دعوتی شعور سے محرومی کی بنا پر انھوں نے وہ کسوٹی کھو دی تھی جس پر جانچ کر وہ معلوم کر سکیں کہ ان کی کونسی روش اسلام کے مطابق ہے، اور کونسی روش اسلام کے مطابق نہیں۔

مسلمانوں کے اوپر اپنے عقیدہ کے اعتبار سے لازم ہے کہ وہ داعی اور مدعو کی اصطلاحوں میں سوچیں۔ وہ اپنی انفرادی اور قومی سرگرمیوں کی تشکیل میں دعوت کو اصل معیار بنائیں۔ وہ دعوت کی

مصلحت کو تمام دوسری مصلحتوں پر مقدم رکھیں۔ وہ ہر نقصان کو گوارا کرلیں، مگر دعوت کا نقصان کسی قیمت پر گوارا نہ کریں۔ مسلمانوں کے اس داعیانہ منصب کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہرگز کسی ایسی سرگرمی میں مبتلا نہ ہوں جو دعوت کے مزاج کے خلاف ہو، یا دعوت کے امکانات کو برباد کرنے والی ہو۔

اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو یقینی طور پر وہ خدا کے یہاں مجرم قرار پائیں گے، خواہ انھوں نے اپنے دعوت کش جلوس کا نام شوکت اسلام جلوس رکھ لیا ہو، اور خواہ اس کی قیادت کے لیے ان کے تمام اعاظم واکابر اکھٹا ہو گئے ہوں۔

موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اگر ذرا بھی ان کے خلاف مزاج بات کرے تو وہ فوراً مشتعل ہو کر اس سے لڑنے لگتے ہیں ــــــ کوئی ان کی مسجد کی دیوار پر رنگ ڈال دے۔ ان کی نماز کے وقت کوئی گھنٹہ بجا دے۔ کسی کا جلوس ان کے محلہ کی سڑک سے گزر جائے۔ کوئی ایسا نعرہ لگا دے جو ان کے قومی وقار کے خلاف ہو۔ کوئی شخص ایک قابل اعتراض بیان اخبار میں چھاپ دے۔ اس قسم کی کوئی ادنی اشتعال انگیزی بھی انھیں مشتعل کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اتنا بے خود ہو جاتے ہیں کہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو لڑائی وہ چھیڑ رہے ہیں اس میں دوسرا فریق چھری ثابت ہوگا اور وہ خود خربوزہ کی مثال بن کر رہ جائیں گے۔

ناگوار باتوں پر مشتعل ہو جانے کی اس فہرست میں سب سے زیادہ نمایاں چیز وہ ہے جس کو "ناموس رسول پر حملہ"، یا "رسول کی شان میں گستاخی" جیسے جذباتی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس نوعیت کی اگر کوئی افواہ بھی پھیل جائے تو اس کے بعد مسلمان اس طرح بھڑک کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام تو درکنار عقل وہوش سے بھی ان کا دور کا کوئی تعلق نہیں۔

مسلمانوں کا یہ لغو مزاج صرف اس لیے ہے کہ انھوں نے دعوت کا شعور کھو دیا ہے۔ دوسری اقوام کو وہ صرف اپنا قومی رقیب اور دنیوی حریف سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہر بات کو وہ فوراً قومی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اگر ان کے اندر داعیانہ شعور زندہ ہو تو وہ دوسری اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں گے۔ اس کے بعد دوسری اقوام سے انہیں نفرت کے بجائے خیر خواہی پیدا ہو جائے گی۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں پر وہ اسی طرح صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے جیسا کہ رسول اور اصحاب رسول نے اختیار

کیا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کے اندر دعوتی شعور پیدا کیا جائے۔ ان کے اندر یہ احساس بیدار کیا جائے کہ وہ داعی ہیں اور دوسری قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی سے ان کی جھوٹی جذباتیت ختم ہوگی۔ اسی سے ان کے اندر یہ حکمت آئے گی کہ وہ ناگوار باتوں سے اعراض کریں اور اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل نہ ہوں، دعوتی شعور ان کے اندر صبر، حکمت، بصیرت اور بلند فکری جیسی صفات پیدا کرے گا۔ اور بلاشبہ یہی وہ صفات ہیں جو کسی آدمی کے لیے دنیا کی کامیابی کا بھی زینہ ہیں اور آخرت کی کامیابی کا زینہ بھی۔

زیر نظر کتاب میں اس مسئلہ کا مطالعہ سلمان رشدی کے واقعہ کے ذیل میں کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس موضوع پر ایک علمی اور صحت مند بحث کا آغاز ثابت ہو۔

وحید الدین ۲۷ جون ۱۹۸۹

اسلام مغربی لٹریچر میں

ڈاکٹر ہٹی (Philip K. Hitti) عربی زبان اور تاریخ کے مشہور ماہر ہونے کی حیثیت سے مغربی دنیا میں مشرق قریب کے مسائل پر سند سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے عرب اور اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور مختلف انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار ہیں۔ ان کی کتابیں یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہی ہیں۔ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اور اس وقت پرنسٹن یونیورسٹی (نیوجرسی) میں سامی ادب کے پروفیسر ہیں۔

اسلام اور مغرب (Islam and the West) ڈاکٹر ہٹی کی کتاب ہے جو ۱۹۶۲ء میں امریکہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ۱۹۰ صفحات ہیں اور اس کا موضوع عیسائی دنیا اور اسلام کے تمدنی تعلقات کی تاریخ ہے جس میں بازنطینی سلطنت کے وقت سے لے کر اب تک مختلف قسم کے اتار چڑھاؤ پائے جاتے رہے ہیں۔ موصوف نے ترجموں کی مدد سے نہیں بلکہ اصل مآخذ سے براہ راست استفادہ کر کے یہ کتاب تیار کی ہے۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کے ابتدائی تین ابواب میں اسلام کا بالترتیب مذہب، ریاست اور کلچر کی حیثیت سے تعارف ہے۔ چوتھا باب ہے ـــــ "اسلام مغربی لٹریچر میں" پانچویں اور چھٹے باب میں بالترتیب مشرق کا مغرب پر اور مغرب کا مشرق پر نفوذ و اثر دکھایا گیا ہے۔ ساتویں باب میں اس تحریک کا مختصر تعارف ہے جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں جاری ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں قرآن اور دوسری قدیم کتابوں سے اسلام اور اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کے بارے میں اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔ یہ اقتباسات کل ۲۹ ہیں۔

ذیل میں کتاب کے چوتھے باب (Islam in Western literature) کا ترجمہ دیا جا رہا ہے، اس معذرت کے ساتھ کہ نقل کفر کفر نباشد۔

قرون وسطیٰ کے مغربی لٹریچر میں پیغمبر اسلام کو عام طور پر جعل ساز اور جھوٹے رسول کی حیثیت

سے متعارف کرایا جاتا تھا۔ قرآن ان کی ایک بناوٹی کتاب اور اسلام ایک نفس پرستانہ طریق حیات تھا، دنیا میں بھی اور دوسری زندگی میں بھی۔ اس زمانے میں مذہب، اسلام اور عیسائیت دونوں کے درمیان دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ دونوں طرف یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ان ہی کا مذہب تمام صداقتوں کا واحد خزانہ ہے۔ مگر سیاسی اور فوجی تصادم، نظریاتی تصادم سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

محمدؐ کے بعد ڈیڑھ صدی تک ان کے پیرو پہلے مدینہ، پھر دمشق اور اس کے بعد بغداد سے نکل کر بازنطینی سلطنت کو روندتے رہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے ہوئے مسیحیت کے مشرقی دارالسلطنت کے دروازے تک پہنچ گئے۔ قسطنطنیہ کے سقوط (۱۴۵۳ء) کے بعد چار صدیوں میں مسلم سلجوقی اور عثمانی ترک اپنی ہمسایہ مسیحی طاقتوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئے۔ ۷۱۱ء سے شروع ہو کر تقریباً آٹھ سو برس میں مسلمان اسپین کے ایک حصہ پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے فرانس تک پر دھاوا بول دیا تھا۔ سسلی دو صدیوں تک ان کے قبضہ میں رہا۔ اور اٹلی کے خلاف ایک فوجی اڈے کا کام کرتا رہا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی کے دوران میں مغربی اقوام مسلمانوں کی زمین پر صلیبی جنگ لڑتی رہیں۔ ان صلیبی لڑائیوں کی یاد آئندہ نسلوں میں باقی رہی۔

زرتشت، بدھ مذہب اور دوسرے کم ترقی یافتہ مذاہب کی کبھی اس طرح سے نفرت اور تحقیر نہیں کی گئی، جیسا کہ اسلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ قرون وسطیٰ کے مغرب کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھے۔ اور نہ انھوں نے مقابل میں آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس لئے یہ بنیادی طور پر خوف، دشمنی اور تعصب تھا جس نے اسلام کے بارہ میں مغرب کے نقطۂ نظر کو متاثر کیا۔ اسلام کا عقیدہ ایک دشمن عقیدہ تھا۔ اس لئے وہ غلط نہ ہو جب بھی شبہ کی نظر سے دیکھا جانا لازمی تھا۔

پھر زبان کا روک بھی تھا۔ مسیحیت اور دنیائے اسلام کے درمیان سیاسی اور فوجی تصادم کے چھ سو سال تک یورپ قرآن کی زبان کے باقاعدہ مطالعہ کی سہولت سے محروم رہا۔ اس پوری مدت میں لاطینی زبان کا کوئی عالم یورپ میں ایسا نہیں ملتا جو عربی زبان پر بھی عبور رکھتا ہو۔ قرآن کی زبان سے اس کامل بے خبری نے قرآن کے بارے میں غلط تعارف کو پھیلنے کا موقع دے دیا۔

قرون وسطیٰ اور اس کے بعد کی مسیحیت نے جس تحریری یا زبانی ذرائع سے اسلام کے بارہ میں اپنا تصور قائم کیا، وہ وہی تھا جو صلیبی جنگوں کے دوران میں وجود میں آئے یا ان ممالک کی معرفت ملے

جن سے اسلام کی لڑائی پیش آچکی تھی۔ مسیحی علماء اور پادریوں نے اسی کے ذریعہ سے اسلام کی تصویر بنائی۔ اسلام کی اس یورپی تصویر اور اس کی حقیقی اسلامی تصویر میں کوئی مشابہت محض اتفاقی ہے۔

شام کے مشہور عیسائی عالم سینٹ جان آف دمشق (۷۴۹ء) کو بازنطینی روایات کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ جان نوجوانی کی عمر میں بنو امیہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ وہ عربی، سریانی اور یونانی زبانیں جانتا تھا اور اپنے زمانہ کے اہل علم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کیا ہے جس میں ایک جھوٹے رسول کی پرستش ہوتی ہے۔ اس کے بیان کے مطابق محمدؐ نے ایک آرین راہب کی سرپرستی میں بائبل کی مدد سے اپنے اصول وضع کئے۔ یہ اسلام کے متعلق عیسائیت کے قدیم اور عام تصور کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ ڈانٹے (م ۱۳۲۱ء) نے اپنی مشہور کتاب میں محمدؐ اور علیؓ کو نویں جہنم کے سپرد کر دیا جو تفرقہ پردازوں اور رسوا کن اعمال کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے (نعوذ باللہ)

بازنطینیوں میں پہلا شخص جس نے محمدؐ کا باقاعدہ ذکر کیا اور اسلام پر گفتگو کی، وہ مورخ تھیوفین (Theophane) ہے جس کا زمانہ ۸۱۸ ـ ۷۵۸ ہے۔ وہ ایک خانقاہ کا بانی بھی تھا۔ تھیوفین بغیر کسی حوالے کے محمدؐ کو "مشرقی باشندوں کا حکمراں اور ایک بناوٹی رسول" لکھتا ہے۔ ڈانٹے کا ایک ہم عصر مسیحی جس نے بغداد کا سفر کیا تھا، اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ شیطان جب خود مشرقی ممالک میں عیسائی مذہب کی ترقی کو روک نہ سکا تو اس نے اپنی طرف سے ایک آسمانی کتاب تیار کی اور ایک ابلیس فطرت آدمی کو اپنے وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہ آسمانی کتاب قرآن اور وہ وسیلہ محمد ہیں۔ (نعوذ باللہ)

عبدالمسیح بن اسحاق الکندی ایک مشرقی عیسائی تھا۔ اس کو اسپین میں ایک سیدزادہ مسلمان نے تحریری طور پر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ نے عرب کے اس عیسائی کو موقع دیا کہ وہ عیسائیت کا دفاع کرے اور اسلام پر حملہ آور ہو۔ الکندی نے محمدؐ کو ایک شہوت پرست اور ایک قاتل کی حیثیت سے پیش کیا جن کی کتاب محض مصنوعی الہامات کا مجموعہ تھی اور جن کا مذہب دھوکے، تشدد اور نفس پرستانہ تعلیمات کی چاٹ دلا کر پھیلایا گیا۔ (رسالات الکندی مطبوعہ قاہرہ ۱۹۱۲ء)

ان باتوں کے نتیجہ میں عیسائی دنیا میں محمدؐ کے خلاف کچھ ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ کوئی

افسانہ خواہ وہ کتنا ہی عجیب ہو اور اس کی کوئی اصل نہ ہو، فوراً قبول کر لیا جاتا تھا۔ قرطبہ کا ایک بشپ ایولوگیس (Eulogius) جو اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا، وہ ایک لاطینی تحریر کے حوالے سے جو ایک عیسائی راہب نے تیار کی تھی، لکھتا ہے کہ محمدؐ کی وفات کے بعد ان کے اصحاب فرشتوں کا انتظار کر رہے تھے جو اتریں اور ان کے جسم کو اوپر لے جائیں۔ مگر اس کے بجائے کتے آئے اور ان کے جسم کو کھا گئے اسی لئے مسلمان ہر سال بہت بڑے پیمانے پر کتوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ ایولوگیس، اسپین کے مسلم دارالسلطنت میں رہتا تھا۔ وہ معمولی کوشش سے جان سکتا تھا کہ اس پورے افسانہ میں صرف اتنی سی حقیقت ہے کہ مسلمان کتے کو ایک ناپاک جانور سمجھتے ہیں۔

لاطینی زبان سے یہ کتے کا افسانہ فرانسیسی میں پہنچا۔ چنانچہ ایک قدیم فرانسیسی نظم میں کتے اور سور دونوں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ محمدؐ کے جسم کو کھا رہے ہیں۔ سور کی یہ روایت عوام میں بہت مقبول ہوئی اور قرآن میں سور کی حرمت کی بہت آسان توجیہہ بن گئی۔ (حالاں کہ سور کی حرمت آپ کی وفات سے بہت پہلے کا واقعہ ہے ـــــ دروغ گو را حافظہ نباشد، مترجم) اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ محمدؐ کا تابوت زمین و آسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے۔ اور لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی میں صلیبی جنگوں کے ذریعہ اسلام کو مغلوب کرنے کی کوشش جب ناکام ہو گئی تو مسیحی حلقہ میں ایک نیا رجحان ابھرا ـــــ اسلام کو تبلیغ و تحریص کے ذریعہ تباہ کیا جائے۔ بے دخلی کی کوشش کی جگہ عقیدہ کی تبلیغ نے لے لی۔ مشنری تحریک وجود میں آئی۔ کارملی رہبانوں کا حلقہ (Carmelite Friar Order) ایک صلیبی ہی نے (۱۱۵۴) ماونٹ کارمل پر قائم کیا تھا۔ اس صلیبی کا نام (Berthold) ہے۔ اس جماعت کے لوگ سفید چغہ پہنتے تھے، اسی لئے ان کو سفید پوش رہبان (White Friars) کہا جاتا ہے۔ (مترجم) فرانسس کن نے اس کی پیروی کی۔ ۱۲۱۹ء میں سینٹ فرانسس آف اسیسی قاہرہ گئے اور اپنی فرانسس کن مشنری سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مگر اس دور کی سب سے بڑی مشنری تحریک ایک اسپینی تحریک تھی، جو ریمنڈ لل (Raymond Lull) نے شروع کی جس کا زمانہ ۱۲۳۵ - ۱۳۱۵ ہے۔ لل نے روحانی صلیبی جنگ (Spiritual Crusades) کے لئے بہت دانشمندانہ نقشے بنائے جس کا مقصد مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ بحث و مناظرہ اور استدلال کے ذریعہ کامیاب ہونے کے بارے میں اس کا یقین آخر وقت تک قائم رہا۔ اس کی تیاری کے لئے اس نے عربی

پڑھی اور اپنی خانقاہ میں اس کا درس دینا شروع کیا جو اس نے مرامر (Miramar) میں قائم کی تھی۔ اس کی عربی زبان اور اسلام سے اس کی واقفیت اس زمانہ میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی مگر ٹیونس میں اس کی مشنری سرگرمیاں ناکام ہوگئیں۔ توحید پرست مسلمانوں کے ذہن میں تثلیث کا عیسائی عقیدہ بٹھانے کی کوشش اتنی فضول تھی کہ بالآخر اس نے اسلام پر حملہ کرنا شروع کیا۔ وہ گلیوں میں نکل کر چلاتا پھرتا تھا۔ "عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ غلط ہے۔" ٹیونس میں ایک مشتعل مجمع نے اس پر حملہ کیا اور پتھر مارنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک ہوگیا۔

عیسائیت اور اسلام میں زبان کا روک پہلی بار اس وقت ٹوٹا جب فرانس میں قرآن کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یہ بیرونی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ تخمیناً ۱۱۴۱ء میں کیا گیا اور اس کے کرنے والے تین عیسائی اور ایک عرب باشندہ تھا۔ اس ترجمۂ قرآن کے ساتھ ایک ضمیمہ اس عنوان کے ساتھ لگا ہوا تھا ــــــ "مسلمانوں کے عقائد کی تردید" اس کے بعد ۱۶۴۹ میں سیور ڈوریر (Sieur du Ryer) نے اس ترجمہ کی مدد سے قرآن کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔ یہ شخص اسکندریہ میں فرانسیسی قونصل رہ چکا تھا۔ پھر اسی سال سیور ڈوریر نے براہِ راست عربی زبان سے فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا۔ اور اس کے بعد اس کو محمد کا قرآن (The Alcoran of Mahomet) کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا گیا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کا مقصد مترجم کے الفاظ میں "ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنا تھا جو ترکی کے کھوکھلے مذہب (Turkish Vanities) کے جاننے کے خواہشمند تھے۔ لفظ Mahomet خود محمدؐ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ آکسفرڈ انگلش ڈکشنری میں اس کی اٹھارہ شکلیں بتائی گئی ہیں۔ اسی طرح Mahound کی سترہ شکلیں Mohammad کی پانچ Muhammad کو لے کر ایک ہی نام کی ۴۱ مختلف شکلیں۔ (مصنف نے یہاں Maumet کو شمار نہیں کیا جس کی سب سے زیادہ شکلیں آکسفرڈ ڈکشنری میں بتائی گئی ہیں اور ان کو شامل کرنے کے بعد ناموں کی یہ فہرست ستر سے بھی زیادہ تک پہنچ جاتی ہے (مترجم)

قرآن کا یہ گمنام ترجمہ الکزنڈر راس (Alexander Ross) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اسپین میں نام نہاد مورس (Moors) کے زوال کے بعد عثمانی ترک دشمن مذہب (اسلام) کے علم بردار نظر آرہے تھے۔ مارٹن لوتھر نے پہلے یہ خیال کیا کہ ترکوں کو مسیحیت کے گناہوں کی پاداش میں

خدا کا بھیجا ہوا عذاب سمجھ کر گوارا کرنا چاہئے۔ مگر ۱۵۲۹ میں جب ترک وائنا کے دروازوں تک پہنچ گئے تو اس نے اپنے ذہن کو بدل دیا اور یہ تبلیغ کی کہ ان کافروں کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن کا پہلا انگریزی ترجمہ براہ راست عربی زبان سے ۱۷۳۴ میں کیا گیا، اور اس کا مترجم جارج سیل (George Sale) تھا۔ سیل عیسائی علوم کی ترقی کی انجمن کا ایک رکن تھا اور اس نے شامی علماء کی مدد سے عربی زبان سیکھی تھی۔ سیل کا ترجمہ انگریزی دنیا میں ڈیڑھ صدی تک چھایا رہا۔

سترہویں صدی میں ایک نیا سنگ میل پیدا ہوا جب آکسفرڈ یونیورسٹی نے عربی کی تعلیم کے لئے ایک نشست اپنے یہاں مخصوص کی۔ اور ایڈورڈ پکاک (Edward Pocock) کو ۱۶۳۶ میں اس منصب پر مقرر کیا۔ پکاک چھ سال تک شام میں پادری کی حیثیت سے رہ چکا تھا اور عربی میں دستگاہ اور اسلام کی براہ راست معلومات حاصل کر چکا تھا۔ آکسفرڈ میں عربی شعبہ کے کھلنے سے یورپی عربی داں پیدا ہونے کا دروازہ کھل گیا۔ پکاک خود غالباً اپنی صدی کا سب سے بڑا یورپی عربی داں تھا۔ اس نے متعدد کتابیں تصنیف یا ایڈٹ کیں۔ اس نے اپنے قارئین کو یقین دلایا کہ معلّق تابوت کا افسانہ مسلمانوں کے لئے ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کو وہ صرف عیسائیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ اس نے مزید اس مروجہ کہانی کو چیلنج کیا کہ اسلام کے بانی نے ایک سفید کبوتر کو تربیت دے رکھا تھا تاکہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لئے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے متبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعہ سے روح القدس ان کو الہام کر رہا ہے۔ یہ افسانہ اس قدر مشہور ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ شکسپیئر کے ایک کردار کی زبان سے ہم سنتے ہیں:

Was Mahomet inspired by a dove,
Thou with an eagle art inspired then.

شکسپیئر سے بہت پہلے جان لڈگیٹ (John Lydgate) م ۱۴۵۱ اس کبوتر کا رنگ تک جانتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کبوتر کا رنگ دودھیا سفید تھا۔ پھر یہ یقین یہاں تک بڑھا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک کبوتروں کے ماہر نے ایک خاص قسم کے کبوتر کا نام موت (Maumet) رکھ دیا جو دراصل لفظ محمدؐ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کبوتر عیسائیوں کے یہاں تو روح القدس کی علامت ضرور ہے (لوقا ۳ : ۲۲) مگر اسلام میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

اسی طرح مومٹ (Maumet) کا لفظ بت کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ وہ شخص جس نے کعبہ میں سیکڑوں بتوں کو توڑا، جس کے پیرو فخر کرتے ہیں کہ وہی صرف حقیقۃً توحید پرست ہیں اور کسی قسم کے بت یا مورتی کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہی شخص مغربی من گھڑت میں ایک خدا اور ایک بت بن گیا۔ قرون وسطیٰ کی انگریزی روایات میں مہون (Mahoun) بار بار پرستش کا ایک مظہر قرار دیا گیا ہے۔ یہ مان لیا گیا تھا کہ ترکوں اور مسلمانوں کے یہاں اس کی پوجا ہوتی تھی۔

مومٹ کی طرح قرآن بھی الکرون (Alkaron) کے نام سے مسلمانوں کا ایک بت قرار پایا۔ مغربیوں کو یقین دلایا گیا کہ مسلمان اپنے بتوں کے آگے عبادتی رسوم منعقد کرتے ہیں جن میں لوبان جلایا جاتا ہے اور نرسنگھا پھونکا جاتا ہے۔ اسی طرح سورج (Apollo) ان کا دوسرا دیوتا تھا۔ ایک فرانسیسی مصنف کے بیان کے مطابق ۷۸ء میں شارلی مین کی فوجوں سے مسلمانوں کو "شکست" ہوئی تو انھوں نے اپنا غصہ سورج دیوتا کے اوپر نکالا اور اس پر پل پڑے۔ ایلزبتھ کے دور کا ایک اور نامور مصنف فرانسس بیکن (Francis Bacon) محمدؐ کو عطائی (Mountebank) قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنے مقالہ "ہمت و استقلال" (Boldness) میں نقل کیا ہے:

"محمد نے لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ایک پہاڑی کو بلائیں گے اور وہ ان کے پاس چلی آئے گی۔ لوگ جمع ہوئے۔ محمد نے پہاڑی کو اپنے پاس آنے کے لئے کہا۔ وہ بار بار پکارتے رہے اور جب پہاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی تو وہ ذرا بھی نہیں شرمائے۔ بلکہ انھوں نے کہا ــــ "اگر پہاڑی محمد کے پاس نہیں آسکتی تو محمد تو پہاڑی تک جا سکتے ہیں۔"

Works of Francis Bacon, Vol. II. London 1929, p. 279

مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں اس واقعہ کی کوئی اصل موجود نہیں ہے۔ تاہم قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے اس خلاف اسلام انداز کو نہیں اپنایا تھا۔ صلیبی دور کا ایک بشپ جس کی پیدائش شام میں ہوئی تھی، ولیم آف ٹرپولی (William of Tripoli) نے ۱۲۷۰ء میں ایک رسالہ لکھا جس میں اگرچہ محمد کو وہ جھوٹے رسول کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ مگر آپ کے حالات میں دشنام طرازی اور افسانوی حصے کو بہت کم کر کے پیش کیا ہے۔ اسی طرح ۱۶۷۹ء میں ایک انگلش پادری لانسلاٹ ایڈیسن (Lancelot Addison) نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے ان من گھڑت اجزاء کو الگ کرنے کی

کوشش کی جو محمد کے نام کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ بعض بعض مواقع پر اس نے پہلے کسی واقعہ کی افسانوی تصویر کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اڈلیسن کے ایک ہم عصر ہمفری پرائیڈکس (Humphrey Prideaux) نے آپ کی مکمل سوانح حیات لکھی جس میں کبوتر کے قصہ کو اور اسی طرح دوسری بہت سی کہانیوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ان کو صحیح ماننے کے لئے کوئی واقعی بنیاد موجود نہیں ہے۔ تاہم اس سوانح حیات کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام ایک مکارانہ مذہب (Fraudulent Religion) کا معیاری نمونہ ہے۔ یہ سوانح عمری ایک صدی تک مغربی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی تھی۔

زیادہ رواداری کا نقطۂ نظر اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں مغرب کے عربی دانوں نے اسلام کے متعلق زیادہ قابل اعتماد ذرائع کا ترجمہ کیا۔ سیاح اور تاجر زیادہ اچھے تاثرات لے کر لوٹے اور سفیروں اور مشنری کے عہدیداروں نے بھی اضافۂ معلومات میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر جارج سینڈیز (George Sandys) جس نے قسطنطنیہ، مصر اور فلسطین کی زیارت کی تھی، وہ ۱۶۱۵ء میں اپنے سفر کی روداد لکھتے ہوئے مسلمانوں کی اور بہت سی چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ کی تعریف کرتا ہے جو عیسائی اور یہودی غربا کو بھی دی جاتی تھی۔ تاہم زیادہ تر مثالوں میں لوگ ذاتی تحقیق سے زیادہ روایتی معلومات ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ حتیٰ کہ متخصصین پروفیسروں تک کا یہ حال تھا کہ پیدائشی طور پر سنی سنائی روایات کو دہرا دیا کرتے تھے۔ پکاک کا جانشیں جوزف وائٹ (Josef White) ۱۷۸۴ میں اپنے مشہور بیمپٹن لکچرز (Bampton lectures) میں مسیحیت کی حمایت کرتے ہوئے جب اسلام پر آیا تو محمد کے لئے اس کے پاس جو لفظ تھا وہ وہی عام روایتی لفظ تھا یعنی مکار اور فریبی (Imposter) اسی طرح بعد کے ممتاز علماء مثلاً ولیم میور (اڈنبرا یونیورسٹی) ڈاسیں۔ مارگولیتھ (آکسفرڈ) ہنری لامنز (بیروت یونیورسٹی) کے یہاں بھی قدیم رجحانات کے آثار ملتے ہیں۔

مقالہ نگاروں اور مورخوں کے ہاتھوں میں محمدؐ، قرآن اور اسلام کا معاملہ اس سے بہتر رہا ہے جو پہلے مذہبی علماء، ناول نگاروں اور شاعروں کے ہاتھ میں ان کا حشر ہوا تھا۔ اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر نام سائمن آکلے (Simon Ockley) کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا۔ اس نے مسلمانوں کی تاریخ پر دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ کیمبرج کا یہ عالم بھی مکار (Imposter) کو محمد کے ہم معنی لفظ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اور اسلام اور توہمات اس کے یہاں مرادف الفاظ ہیں۔ مگر

مخصوص تاریخی واقعات کے بیان میں اس نے راست گوئی سے کام لیا ہے۔ شام کی فتح کا حال بتاتے ہوئے، مثال کے طور پر، وہ بازنطینیوں کی غارت گری اور دغا بازی کا مقابلہ ابوبکر کی فوجوں کی شجاعت اور ان کے اعلیٰ رویہ سے کرتا ہے جن کو خلیفہ کی ھدایت تھی کہ کسی عورت یا بچہ کو قتل نہ کریں، کھجوروں کے درخت نہ کاٹیں اور نہ کھیت کو نقصان پہنچائیں۔ آکلے کی اس کتاب نے مستند درجہ حاصل کیا اور گبن کے ظہور سے پہلے تک وہ عرب تاریخ پر بنیادی ماخذ سمجھی جاتی رہی۔

اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) جو جدید انگریزی تاریخ کا بانی ہے، اس نے اپنی مشہور کتاب "سلطنت روما کا زوال" کی پانچویں جلد کے پچاسویں باب کو اس موضوع کے لئے مخصوص کیا ہے۔ اپنے اعتراف کے مطابق وہ "مشرقی زبانوں سے مکمل طور پر ناواقف" تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس کا ماخذ وہی کتابیں تھیں جو اس سے پہلے یورپ میں لکھی گئی تھیں اور اس بنا پر اس کی ترجمانی بھی واقعہ کے مطابق نہ ہوسکی۔ تاہم اس نے بہت سی روایات کو غلط قرار دیا مثلاً اس نے کہا کہ مکار نبی کا لقب ایک خطرناک اور ناقابل اعتبار (Perilous and Slippery) چیز ہے۔

فرانس میں والٹیر پیدا ہوا جو بحیثیت مورخ زیادہ محتاط تھا مگر بحیثیت المیہ نگار (Tragedian) محتاط نہیں تھا۔ اپنی تاریخی کتاب ۱۷۵۶ میں وہ محمدؐ کا ذکر رواداری کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ محمد کا مقابلہ کرامویل (Cromwell) سے کرتا ہے۔ وہ ان کے کارناموں کو انگلینڈ کے نجات دہندہ (کرامویل) سے بہت زیادہ عظیم قرار دیتا ہے مگر اپنے المیہ ناٹک (Tragedy) ۱۷۴۲ میں وہ محمد کو قرون وسطیٰ کے لباس میں مکار، ظالم اور عیاش بنا کر پیش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ والٹیر کا اسلام پر حملہ، عمومی طور پر اس کے مخالف مذہب ہونے کا نتیجہ تھا۔ والٹیر کا انحصار انگریزی ماخذ پر تھا۔ خاص طور پر سیل کا ترجمہ قرآن کیوں کہ وہ انگلینڈ میں رہا تھا اور انگریزی زبان سیکھی تھی۔

والٹیر سے زیادہ جرمن شاعر گوئٹے (۱۸۳۲ - ۱۷۴۹) وہ شخص تھا جو جدید اسپرٹ اور نئے بین اقوامی نقطۂ نظر کا پیغامبر بنا۔ گوئٹے نے اپنی زندگی میں محمدؐ کے حالات پر ایک نظم شروع کی مگر وہ اس کو مکمل نہ کرسکا۔ گوئٹے یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ عربی پیغمبر ایک مکار شخص تھا۔ سعدی کی گلستاں کے جرمن ترجمے نے خاص طور پر گوئٹے کو بہت متاثر کیا۔ ۱۸۱۲ میں حافظ کے کلام کا جرمن زبان میں ترجمہ ہوا تو گوئٹے کو اس میں حکمت، تقدس اور سلامتی نظر آئی جو اس کے خیال میں مغرب

کو خاص طور پر درکار تھی۔

اسلامی کلچر کے بارے میں مغربی علماء کا بدلا ہوا نقطہ نظر جس کا آغاز انگریز اور فرانسیسی پروفیسروں نے کیا تھا اور جرمن اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے جس کو تقویت دی تھی، وہ انیسویں صدی کے وسط تک بالکل واضح ہوگیا۔ کارلائل کا محمدؐ کو پیغمبرانہ ہیرو کے کردار کے لئے منتخب کرنا، بیک وقت نئے رجحان کی طرف اشارہ تھا۔ اور اس میں اضافہ کرنے والا بھی تھا۔ کارلائل کی کتاب میں مشکل سے کوئی ناخوشگوار فقرہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کتاب اس لئے قابل تنقید ہوسکتی ہے کہ وہ غیر تنقیدی ہے "محمدؐ ایک سازشی مکار ہیں، وہ جھوٹ کا مجسمہ ہیں۔ ان کا مذہب محض عطائی نسخوں کا مجموعہ ہے ـــــ اس قسم کی باتیں کارلائل کو گوارا نہیں تھیں۔ اس کا ہیرو (محمد) واقعی ایک انسان تھا، سچا انسان۔

عرض مترجم

اوپر جو ترجمہ نقل کیا گیا ہے، وہ بتاتا ہے کہ عیسائی حضرات نے پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لئے کتنی زیادہ لغو حرکتیں کی ہیں۔ مزید یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں پیغمبروں کے ساتھ کس قدر ظالمانہ سلوک کیا گیا ہے۔

خدا کے پیغمبر خالص سچائی کے علمبردار تھے۔ ان کا وجود ان لوگوں کو غیر معتبر ثابت کرنے کے ہم معنی تھا جو جھوٹ پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبروں کو برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے پیغمبروں کی سخت ترین مخالفت کی اور ان کے بعد ان کی تاریخ کو اس طرح بگاڑ ڈالا کہ کوئی شخص ان کی سیرت اور ان کے پیغام کو جاننا چاہے تو اس کے لئے اس کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ممکن ہی نہ رہے۔

اوپر یورپ کے مسیحی لٹریچر کی جو مثالیں، نقل کفر کفر نباشد کے اصول کے تحت درج کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی وہی سب کچھ بدترین شکل میں کیا گیا جو دوسرے پیغمبروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ آپ کے مخالفین نے آپ کی سیرت اور آپ کے پیغام کو بگاڑنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتے تھے۔

مگر یہاں دونوں کے درمیان ایک زبردست فرق ہے۔ دوسرے پیغمبروں کی سیرت اور

ان کے پیغام کو بگاڑنے والے بظاہر اپنے اعتبار سے کامیاب ہوگئے۔ یعنی انھوں نے بگاڑنا چاہا اور عملاً بگاڑ دیا۔ چنانچہ ان سابق پیغمبروں کے بارہ میں آج قرآن کے باہر کہیں صحیح تاریخی ریکارڈ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ ان کی اپنی کتابوں میں بھی نہیں۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کے معاملہ میں صورت حال بالکل مختلف رہی۔ یہاں مخالفین کی ساری کارروائیاں بالکل ناکام ہوکر رہ گئیں۔ لوگوں کی بدترین مخالفانہ کوششوں کے باوجود، آج آپ کی تاریخ اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات کا متن اس طرح کامل صورت میں محفوظ ہے کہ اس سے زیادہ محفوظ اور مستند صورت موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔

یہ کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ فرق دراصل پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الرسل ہونے کا عظیم الشان ثبوت ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو پیغمبر آئے، وہ علم الٰہی کے مطابق، سلسلہ نبوت کے خاتم نہ تھے۔ ان کے بعد بھی نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہنے والا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا کہ ان کے مخالفین کی معاندانہ کارروائیوں کو غیر موثر بنا دے تاکہ وہ ان کی تاریخ اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنے سے عاجز رہ جائیں۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ علم الٰہی کے مطابق وہ آخری رسول اور خاتم النبیین تھے۔ آپ کے بعد پھر کوئی نبی یا رسول آنے والا نہ تھا، اس لئے ضروری تھا کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کامل طور پر محفوظ رہے۔ کیوں کہ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیم کے غیر محفوظ ہو جانے کی صورت میں دوسرے نبی کا آنا ضروری ہو جاتا۔

خاتم النبیین صرف سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے نہ تھے، اسی کے ساتھ آپ مخالفین حق کے لئے اس موقع کو بھی ختم کر دینے والے تھے کہ وہ پیغمبر کی سیرت اور اس کی تعلیمات کو بگاڑنے یا مٹانے میں کامیاب ہوسکیں۔ ختم نبوت لازمی طور پر حفاظتِ نبوت کی مقتضی ہے، اور اس کا اہتمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری طرح کر دیا گیا ہے۔

اب پیغمبر کی آمد کا سلسلہ بلاشبہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر خود ختم نبوت ہی کے طفیل میں مومنان نبوت کو ایک عظیم الشان خدائی مدد ابدی طور پر حاصل ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ پیغمبر خدا کی سچی اور بے آمیز دعوت کو لے کر اٹھیں تو ان کے مخالفین کی بڑی سے بڑی کوششیں ہبا اً منثورا ہو کر رہ جائیں گی۔ دعوتِ رسالت کو بدنام کرنے یا اس کو ناکام بنانے کی ہر کوشش کا وہی انجام

ہوگا جو خود ذات رسالت کے معاملہ میں ہوا۔ یہ خداوند عالم کا فیصلہ ہے، اور خداوند عالم کے فیصلہ کو کوئی بدلنے والا نہیں۔

ختم نبوت کا لازمی تقاضا حفاظت نبوت ہے، اور حفاظت نبوت کا لازمی تقاضا حفاظت امت۔ یہ تینوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ ختم نبوت اس کے بغیر مکمل نہیں کہ نبوت کا ریکارڈ پوری طرح محفوظ حالت میں موجود رہے۔ اور اس عالم اسباب میں نبوت کا ریکارڈ اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب کہ ایک امت مسلسل اس کی پشت پر کھڑی ہوئی ہو۔

یہ صورت حال امت محمدی کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اب امت کو صرف ایک کام کرنا ہے۔ وہ نبوت کی چوکیدار بنی رہے، جس میں نبوت کی تبلیغ و اشاعت بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ اس کے بعد اغیار اور اعداء کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کا کام خود خدا کی طرف سے قیامت تک کیا جاتا رہے گا، اس کے لئے امت کو الگ سے اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ اسلام نہیں

بنگلور کے انگریزی اخبار دکن ہرالڈ نے اپنے سنڈے اڈیشن ۷ دسمبر ۱۹۸۶ میں پی کے این نمبوری کے نام سے ایک کہانی چھاپی۔ اس کا عنوان (نقل کفر کفر نباشد) یہ تھا: Mohammad the Idiot یہ عنوان بلاشبہ لغو ہے۔ مگر اس کے جواب میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ بھی یکساں طور پر لغو ہے۔ وہ اس مضمون کو دیکھ کر مشتعل ہوگیے۔ انھوں نے اخبار مذکور کے دفتر پر دھاوا بول دیا اور اس کے گودام کو جلا ڈالا جس میں ایک کرور روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ ان مسلمانوں نے اپنے اس عمل کو اسلامی جہاد کا نام دیا ہے۔ مگر یہ غلطی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ اس قسم کا ہر فعل مسلمانوں کی قومی اُدھم بازی ہے نہ کہ وہ مقدس عمل جس کو قرآن و حدیث میں جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔

مذکورہ اخبار نے جو بے ہودہ گوئی کی وہ اسلامی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں۔ موجودہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو امتحان کی آزادی عطا کی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات عین اس وقت سے پیش آرہے ہیں جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس دنیا میں موجود تھے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ آپ نے جب عربوں کے سامنے اپنی پیغمبرانہ دعوت پیش کی تو انھوں نے آپ کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ انھوں نے آپ کو عملی طور پر ستانے کے علاوہ آپ پر طرح طرح کے بُرے القاب چسپاں کیے۔ ان میں سے چند القاب لغوذ باللہ یہ تھے:

متقوّل : بات بنانے والا

ساحر : جادوگر

مجنون : دیوانہ

کذّاب : بہت جھوٹ بولنے والا

مذکورہ مسلمان اگر واقعۃً "اسلامی جہاد" کرنا چاہتے تھے تو ان کا فرض تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن اور حدیث اور سیرت کو دیکھ کر معلوم کرتے کہ اس طرح کی صورت حال جب دور اول میں پیش آئی تو خود رسولؐ اور آپ کے اصحابؓ نے اس معاملہ میں کس قسم کا رد عمل پیش کیا۔ اور پھر وہ وہی کرتے جو رسول اور اصحاب رسول کے نمونہ سے ثابت ہو رہا ہو۔ سیرتِ رسول اور اسوۂ صحابہ سے بے نیاز ہو کر

موجودہ قسم کی اشتعال انگیز کارروائی اپنے نفس کا اتباع ہے نہ کہ خدا و رسول کا اتباع۔

جب ہم اس اعتبار سے دور اول کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ قسم کی گستاخی کرنے والے غیر مسلموں کے خلاف کبھی بھی اس طرح کی کارروائی نہیں کی گئی جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے کی یا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف صحابہ کرام نے نہ جلوس نکالا، نہ ان کے گھروں اور جائدادوں کو جلایا۔ اور نہ ان کے خلاف نعرہ بازی کا ہنگامہ کھڑا کیا۔ اس کے بجائے جو کچھ کیا گیا وہ صرف یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعائیں کی گئیں۔ اور دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی تردید کی گئی۔ اس سے آگے ان کا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دیا گیا۔

رسول اور اصحاب رسول کا یہ نمونہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہم ایسے لوگوں کے حق میں اصلاح اور ہدایت کی دعا کریں۔ ان سے ملاقات کر کے پروقار طریقہ سے ان کی غلط فہمی کو دور کریں۔ سنجیدہ اور علمی انداز میں وضاحتی مضامین لکھ کر اخبارات میں شائع کرائیں۔ یہی واحد کام ہے جو مسلمانوں کو کرنا ہے۔ اس کے سوا مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے نہ کہ خدا کی رحمت کو کھینچنے والا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو رحمت بنا کر بھیجا ہے نہ کہ جلانے اور پھونکنے والا بنا کر۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے اس مزاج کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے ان سے ایک عظیم نعمت کو چھین لیا ہے۔ اور وہ داعیانہ کلام کی صلاحیت ہے۔ داعی اپنی قوم کا ناصح ہوتا ہے۔ داعیانہ کلام مخاطب کے لیے محبت اور خیر خواہی کے جذبہ سے نکلتا ہے۔ مگر جب مسلمانوں کا حال یہ ہو کہ وہ بات بات پر بھڑک اٹھیں تو ان کا دل دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور بیزاری کے جذبہ سے بھر جائے گا۔ ان کے اندر وہ معتدل نفسیات باقی ہی نہ رہے گی جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے سنجیدہ اور مدلل انداز میں خدا کے رسول کا پیغام پیش کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جشن رسالت کی دھوم کے باوجود تبلیغ رسالت کا کام بالکل ٹھپ پڑا ہوا ہے۔ پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت پر سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ آپ کے خدائی پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہونچائے۔ مگر پیغام رسالت کو دوسری قوموں تک پہونچانے کے لیے دوسری قوموں کی سچی خیر خواہی درکار ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے منفی مزاج کے نتیجہ میں پہلے ہی اس کو کھو چکے ہیں۔

جہاد یا سرکشی

بنگلور کے انگریزی اخبار دکن ہرالڈ (۷ دسمبر ۱۹۸۶) نے ایک کہانی چھاپی جس میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف گستاخی کا پہلو پایا جاتا تھا۔ اس پر مقامی مسلمان بگڑ گیے۔ انھوں نے اخبار کا گودام جلا ڈالا جس میں ایک کرور روپیہ کا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ پاکستان کے انگریزی اخبار فرنٹیر پوسٹ (۹ جنوری ۱۹۸۷) میں کسی مغربی پرچہ سے ایک مضمون نقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ آدم اور حوا کی ایک تصویر تھی وہ بھی فرنٹیر میل میں چھپ گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں بپھرے ہوئے مسلمانوں نے اخبار کی وسیع عمارت کو گھیر لیا اور اس کو سازوسامان سمیت جلا کر خاکستر کر دیا۔

اس قسم کے واقعات ایک یا دوسری شکل میں ہر اس ملک میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کو عمل کی آزادی حاصل ہے۔ مسلمان اپنی ملی ہوئی آزادی کو اسی قسم کی تخریب کاری میں استعمال کر رہے ہیں اور اس کا نام انھوں نے اسلامی جہاد رکھا ہے۔

اس قسم کا ہر عمل بلاشبہہ غیر اسلامی عمل ہے۔ یہ جہاد نہیں بلکہ سرکشی ہے اور سرکشی اللہ تعالیٰ کے یہاں بدترین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معاملہ کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ایک حدیث کا مطالعہ کیجیے:

عَن ابی هُریرةَ، قَال: اِنَّ رَسولَ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلیهِ وسلم اُتِیَ بِرجلٍ قَدْشَرِبَ الخمرَ فقـــال: "اِضربوهُ" فمنَّا الضاربُ بیدِهٖ، وَالضاربُ بثوبِه. وَالضاربُ بنَعلِهٖ. ثُمَّ قال: "بکـــتوہ" فَاقبلُوا عَلَیهِ یَقولونَ: ما اتَّقیتَ اللهَ، ماخشیتَ اللهَ، وَمَا استحییتَ من رَسول اللهِ صَلَّی اللهُ عَلیهِ وَسلَّم. فَقال بَعضُ القَوم: اَخزَاکَ اللهُ. قَال: "لَاتَقولُوا هٰـکذا، لَاتُعینوا عَلیهِ الشیطٰنَ ولٰکِن قُولُوا: اَللّٰهُمَّ اغفِرلَه، اَللّٰهمَّ ارحمْـه" رواہ ابوداود

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ وہ شراب پیے ہوئے تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو مارو۔ پس ہم میں سے کوئی شخص اس کو ہاتھ سے مارنے لگا اور کوئی شخص کپڑے سے اور کوئی شخص جوتے سے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس کو عار دلاؤ۔ پس لوگ کہنے لگے کیا تم کو ڈر نہیں، کیا تم کو اللہ کا خوف نہیں، کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم نہیں آئی۔ پھر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا تمہیں رسوا کرے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا

کہ اس طرح مت کہو۔ اس کے مقابلہ میں شیطان کے مددگار نہ بنو۔ بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ اس پر رحم فرما۔

اس حدیث سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ صحابۂ کرام نے جب ایک شارب خمر کو دیکھا تو وہ خود اس کو مارنے نہیں لگے۔ بلکہ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے جو اس وقت مدینہ میں صاحبِ امر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اگر ایک ایسا فعل کرے جو ثابت شدہ شرعی جرم کی حیثیت رکھتا ہو تب بھی عوام کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بطور خود اس پر مقررہ سزا کا نفاذ شروع کر دیں۔ سزا کے نفاذ کا حق صرف صاحبِ امر کو ہے۔ اور اسی کی طرف معاملہ کو لوٹایا جانا چاہیے۔

دوسری بات یہ کہ ایک ثابت شدہ مجرم کو سزا دینے کا کام بھی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کو صرف "سزا" دی جائے، اس کو "ذلیل" نہ کیا جائے۔ کوئی بھی قولی یا عملی روش جو ذلیل کرنے کے ہم معنی ہو وہ مجرم کے اندر منفی نفسیات پیدا کرے گی۔ مجرم کو سزا دینے کے ساتھ ذلیل و رسوا کرنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ وہ دین اور اہلِ دین سے متنفر ہو جائے۔ اس طرح کی روش کے نتیجہ میں اس کے اندر ضد اور نفرت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ اس سے پہلے اگر وہ حق سے ایک قدم دور تھا تو اب وہ اس سے سو قدم دور ہو جائے گا۔ شیطان اس کے اندر مخالفانہ جذبات بھڑکا کر اس کو اپنا شکار بنالے گا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات ہے جس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ وہ یہ کہ کسی جرم کی شرعی سزا وہی ہے جو کتاب و سنت سے ثابت ہو۔ اس کے سوا کوئی اور سزا دینا یقینی طور پر فعلِ حرام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً شارب خمر کے لیے اگر شریعت میں یہ سزا مقرر کی گئی ہے کہ اس آدمی کو مارا جائے جس نے شراب پی ہے تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ شارب خمر کے بھائی بہنوں کو مارنے لگے، یا وہ شارب خمر کا گھر جلانے لگے، یا وہ اس کے کارخانے کو لوٹنا شروع کر دے۔

سزا نافذ کرنے والے ادارہ کا کام صرف یہ ہے کہ جب ایسا کوئی کیس سامنے آئے تو وہ تحقیق کرے۔ جب تحقیق اور شہادت سے ثابت ہو جائے کہ متعلقہ شخص فی الواقع مجرم ہے تو ایسے جرم کے لیے شریعت کی جو مقررہ سزا ہے اس کو اس شخص پر نافذ کرے۔ کوئی دوسری سزا نافذ کرنا شریعت کی تعمیل نہیں بلکہ شریعت

سے بغاوت ہے۔ ایسا شخص خود سب سے بڑا مجرم ہے، اس کو حق نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو مجرم قرار دے کر اس کے اوپر اپنی خود ساختہ سزا کا نفاذ کرنے لگے۔

زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہلِ عرب نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ وہ اونچے خاندان کے مجرم اور نیچے خاندان کے مجرم کے درمیان سزا میں فرق کرتے تھے۔ اس پر قرآن میں قصاص کی آیت (البقرہ ۱۷۸) اُتاری گئی۔ اس میں کہا گیا کہ اے ایمان والو، تم پر مقتولین کے معاملہ میں برابری اور مساوات کو فرض کیا گیا ہے۔ سزائے قتل کے معاملہ میں جو لوگ قصاص (برابری) کے شرعی اصول کو اختیار نہ کریں۔ یا مثلاً معافی اور دیت قبول کرنے کے بعد مزید یہ کریں کہ وہ قاتل کو قتل کر ڈالیں تو یہ اعتداء (زیادتی) ہے اور اس قسم کا اعتداء کرنے والوں کے لیے خدا کے یہاں دردناک عذاب ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص قتل کیا جائے تو اس کے وارثوں کے لیے تین میں سے ایک چیز ہے۔ قصاص، یا معاف کر دینا، یا دیت لینا۔ اس کے بعد اگر وہ کوئی چوتھی چیز چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لو۔ جو اس کے بعد بھی زیادتی کرے تو اس کے لیے جہنّم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا (ومن اعتدیٰ بعد ذالك فله نار جهنّم خالد افيها، تفسیر ابن کثیر جلد اوّل، صفحہ ۲۱۰)

اس حکمِ شریعت کے مطابق جرم اور سزا میں برابری ہونا ضروری ہے۔ کسی مجرم کو حدِ شرعی سے زیادہ سزا دینا یا مقررہ سزا کے سوا کوئی اور سزا دینا سراسر حرام ہے۔ ایک شخص سے کوئی شرعی جرم سرزد ہو تو خود مجرم پر شرعی سزا کا نفاذ کیا جائے گا۔ اس کے بجائے اگر اس کے ہم قوموں کو مارا جانا لگے یا مجرم کی جائداد کو تباہ کیا جائے تو یہ سراسر فعلِ حرام ہے۔ جو لوگ ایسا کریں یا جو لوگ ایسا کرنے والوں کی حمایت کریں حتیٰ کہ جو لوگ ایسے فعل کو دیکھ کر خاموش رہیں وہ اپنے آپ کو اس خطرہ میں مبتلا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی سخت ترین بازپرس کی جائے۔

ملک کا اقتدار اگر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے یہ امید نہ ہو کہ وہ مجرم کے اوپر شرعی سزا کا نفاذ کریں گے تب بھی مسلمانوں کے لیے قانون اپنے ہاتھ میں لینا جائز نہیں۔ ایسے ماحول میں مسلمانوں کے لیے نصیحت اور صبر ہے نہ کہ سزا کا نفاذ۔ یہ اصول مکّی دور کے عمل سے ثابت ہے۔ اس وقت مکہ کے لوگ کھلے طور پر شراب پیتے تھے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان پر حد جاری کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ حد کا نفاذ اقتدار ملنے کے بعد کیا گیا۔

جذبات کا اعتبار نہیں

اس طرح کے مواقع پر عام طور پر یہ بات کہی جاتی کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے۔ مگر مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کسی قوم کے جذبات کا مجروح ہونا شریعت میں ہرگز معتبر نہیں۔ یہ شریعت کے حدود و تعزیرات کی کوئی دفعہ نہیں۔ اس قسم کی باتوں کا حوالہ دے کر کسی کو مارنا یا کسی کی جائداد کو جلانا دہرا سرکشی ہے۔ یہ اسلام کی حدود و تعزیرات کی فہرست میں ایک نئے حکم کا اضافہ کرنا ہے جس کا کسی بھی شخص کو کوئی اختیار نہیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ اس قسم کی ناخوشگوار باتوں پر صبر کرتے ہوئے لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں۔ اس کے سوا وہ جو کچھ بھی کریں گے وہ صرف ان کے اپنے جرم میں اضافہ کرنے والا ثابت ہوگا نہ کہ دوسروں کے حق میں اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرنا۔

دوسرا باب

رشدی کی کہانی

۱۷ فروری ۱۹۸۹ کی صبح کو جو اخبارات آئے، ان سب کے صفحہ اول پر یہ سنسنی خیز خبر تھی کہ ایران کے شیعہ رہنما آیت اللہ خمینی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ شیطانی آیات (The Satanic Verses) کے مصنف سلمان رشدی (۴۲ سال) کو قتل کر دیں۔ اسی کے ساتھ ایرانی حکومت نے قتل کرنے والے کے لیے انعام کا بھی اعلان کیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۷ فروری ۱۹۸۹) کے مطابق قتل کرنے والا اگر ایرانی ہے تو اس کو دو ملین ڈالر ($2.6 million) دیے جائیں گے اور اگر قتل کرنے والا غیر ایرانی ہے تو اس کو ایک ملین ڈالر ($1 million) ملے گا۔ ایران کے خود ساختہ لغت میں اسلام بھی ایرانی اور غیر ایرانی ہو گیا۔

۱۹ فروری کے اخبارات یہ خبر لائے کہ سلمان رشدی نے لندن میں ایک بیان جاری کر کے اس کے بارے میں معافی مانگ لی ہے۔ اس نے یہ کہا ہے کہ:

Living in a world of many faiths, the experience had served to remind us that we must all be conscious of the sensibilities of others.

اگلے دن ۲۰ فروری ۱۹۸۹ کو دوبارہ اخبارات نے بتایا کہ ایران کے مذہبی پیشوا آیت اللہ خمینی نے اعلان کیا ہے کہ سلمان رشدی کو معافی مانگنے کے باوجود بخشا نہیں جائے گا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۰ فروری) کے مطابق انھوں نے کہا:

Even if Salman Rushdie repents and becomes the most pious man it is incumbent on every Muslim to employ everything he's got, his life and wealth, to send him to hell.

قومی آواز (۲۳ فروری ۱۹۸۹) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ مزید خبروں کے مطابق سنّی علماء بھی اس ایرانی جہاد میں مکمل طور پر شریک ہو گئے ہیں۔ قومی آواز (۲۰ فروری ۱۹۸۹) کے مطابق، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ناظم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے ایک بیان میں ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی

کے فرمان کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مصنف نے مذہب اسلام کی سخت توہین کی ہے جس سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ امام خمینی کے فرمان پر مسلمان اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں۔ مولانا ندوی نے کہا کہ اسلام میں پیغمبر اسلام کی توہین کے مجرم کو سزائے موت دی جاتی ہے۔ مسلم علماء اور مفتی اس معاملہ میں متفق ہیں (صفحہ ۱)

اس کے بعد اخباری بیانوں، خطوط اور مضامین کا لمبا سلسلہ چل پڑا۔ ہر لکھنے اور بولنے والا مسلمان بڑھ چڑھ کر پُرجوش الفاظ کا مظاہرہ کر رہا تھا اور سلمان رشدی کے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھا۔ تاہم اس لفظی جہاد میں زیادہ تر ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان شریک تھے۔ لندن کی سڑکوں پر جو مظاہرے ہوئے اس کے پیچھے بھی انھیں ملکوں کے مسلمان تھے۔ بقیہ مسلم دنیا نے اس نام نہاد جہاد میں کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا۔ حتیٰ کہ آیت اللہ خمینی کو چھوڑ کر، خود ایرانی قوم بھی بحیثیت مجموعی اس مہم میں شریک نہ ہو سکی۔

قومی آواز (۲۳ فروری ۱۹۸۹) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ مکہ میں علماء اسلام کی ایک میٹنگ کے بعد رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے ایک بیان میں کہا کہ سلمان رشدی مرتد ہے، اور اسلام میں اس جرم کی سزا موت ہے۔ انھوں نے یہ اپیل کی کہ سلمان رشدی کی عدم موجودگی میں کسی اسلامی ملک میں اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ ڈاکٹر نصیف نے کہا کہ رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کو تحریر کی آزادی نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ یہ ایک زبانی مجرمانہ حملہ ہے۔ سلمان رشدی مرتد ہے اور شریعت کے مطابق ارتداد کے جرم کی سزا موت ہے۔ تاہم رابطہ نے اس رسمی بیان کے سوا اس مہم میں اور کوئی قابل ذکر سرگرمی نہیں دکھائی۔

۷ مارچ ۱۹۸۹ کو حکومت ایران نے برطانیہ سے اپنے سفارتی تعلقات ختم کر دیے اور اپنے تمام سفارتی عملہ کو لندن سے واپس بلا لیا (ٹائمس آف انڈیا ۸ مارچ ۱۹۸۹)

جوابی انعام

ٹائمس آف انڈیا (۲۰ فروری ۱۹۸۹، سکشن ۲، صفحہ ۱) پر ایک خبر اس عنوان کے ساتھ چھپی :

For a civilised Khomeini

خبر میں کہا گیا تھا کہ لندن کے ایک بڑے اخبار کے مالک رابرٹ میکسول نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو

شخص آیت اللہ خمینی کو مہذب انسان بنانے کا کام انجام دے، وہ اس کو بطور انعام دس ملین ڈالر (\$ 10.6 million) ادا کریں گے۔ ان کا یہ اعلان لندن کے ہفتہ وار اخبار پیپل (People) میں چھپا ہے۔ اعلان کے مطابق یہ انعام اس شخص کو دیا جائے گا جو ایرانی لیڈر کو اپنی غلطی کے اعتراف پر آمادہ کرے اور ان کو اس پر راضی کرے کہ وہ عوام کے سامنے بائبل کے احکام عشرہ میں سے چھٹا اور نواں حکم پڑھ کر سنائیں جو کہ یہ ہے: تم خون نہ کرنا، تم جھوٹی گواہی نہ دینا:

British newspaper magnate, Mr Robert Maxwell, has pledged 16 million (\$ 10.6 million) to anyone who can "civilise" the Iranian ruler, Ayatollah Ruhollah Khomeini, one of his newspapers announced today. *The People*, a London weekly tabloid, said the money would be paid to anyone who can persuade the Iranian leader to repent "his wicked ways" by persuading him to publicly recite the sixth and ninth of the Ten Commandments in the Christian Bible: "Thou shalt not kill" and "Thou shalt not bear false witness."

رابرٹ میکسول کا یہ بیان حقیقۃً ایک طنز تھا۔ اس کا مقصد بالواسطہ طور پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلام قتل اور خون کا مذہب ہے۔ اس کے مقابلہ میں مسیحیت رحم اور رواداری کا مذہب۔

اسلام کی تصویر بگاڑنا

ٹائم میگزین (۲۷ فروری ۱۹۸۹) کی کور اسٹوری آیت اللہ خمینی کے بارے میں ہے۔ اس کے صفحہ اول پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ آیت اللہ ایک مصنف کی مذمت کرتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ کتاب "شیطانی آیات" اسلام کے خلاف ہے، خمینی اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے:

The Ayatullah condemns an author: Saying the book *The Satanic Verses* "is against Islam," Khomeini calls for the death of Salman Rushdie.

ٹائم نے اپنی رپورٹ میں جو باتیں درج کی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مغرب کے سیاسی لیڈروں نے اس بات پر سخت غصہ کا اظہار کیا ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک کے شہری کے لیے قتل کی سزا کا اعلان کرے۔ اس واقعہ کے بعد مغربی حلقوں میں یہ سوال اٹھ گیا ہے کہ آزاد معاشرے اپنے کو اور اپنے

شہریوں کو تخویف کی ایسی شدید اور سیمابی صورت سے کس طرح بچا سکتے ہیں :

It also raised questions about how free societies can best protect themselves and their citizens against so furious and mercurial a form of intimidation (p.6).

ٹائم نے اہلِ مغرب کے جس تاثر کا ذکر کیا ہے اس کی زد بالواسطہ اعتبار سے اسلام پر پڑتی ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ جو لوگ اپنے یہاں آزادانہ آمد و رفت کا ماحول قائم کیے ہوئے ہیں، وہ اس بات کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ اسلام کا ان کے معاشرے میں آنا ان کی زندگیوں کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ کیونکہ یہ مہذب سماج میں غیر مہذب انسانوں کے داخلہ کے ہم معنی ہے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اسلام جو امن کا دین تھا اور جس کے پیغمبر کو رحمتِ عالم کہا گیا تھا، اس کی تصویر ایسی بنا دی جائے کہ اس کی قربت سے لوگوں کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہونے لگے۔

ریاض کانفرنس کا فیصلہ

۱۴۔ ۱۶ مارچ ۱۹۸۹ کو ریاض میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کا اجتماع ہوا۔ اس میں ۴۶ مسلم ملکوں کے وزرائے خارجہ شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے پر افغانستان کے مسئلہ کے بعد دوسرا سب سے زیادہ حساس مسئلہ سلمان رشدی کے معاملہ پر اپنا فیصلہ دینا تھا۔ سعودی حکمراں شاہ فہد کی تقریر سے اس کا افتتاح ہوا۔ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر چند روزہ بحث کے بعد ۱۶ مارچ ۱۹۸۹ کو مسلم ممالک کے نمائندوں نے اپنا متفقہ فیصلہ دے دیا۔

اس فیصلہ کے مطابق، ۴۶ ملکوں کی تنظیم اسلامی کانفرنس کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں ایران کے واحد اختلاف کے ساتھ "شیطانی آیات" کے مصنف سلمان رشدی کے خلاف آیت اللہ روح اللہ خمینی کے موت کے فتویٰ کو سختی سے مسترد کر دیا گیا۔ سفارت کاروں نے ایرانی فتویٰ کو مسترد کیے جانے کو انتہائی اہم اقدام قرار دیا۔ کانفرنس نے سلمان رشدی کے ناول کو اسلام کی اہانت کرنے والی کتاب قرار دیتے ہوئے عالمی برادری سے اپیل کی کہ وہ مختلف مذاہب کے

پیشواؤں کی دل آزاری نہ کریں۔ سعودی عرب کے شاہ فہد نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو عفو و درگذر سے کام لینا چاہیے۔ اور غلط کاروں کو توبہ کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ انھوں نے اس طرح کے معاملات میں اعتدال پسندی کی تلقین کی (قومی آواز ۱۷ مارچ ۱۹۸۹)

اس فیصلہ سے یہ ظاہر ہو گیا کہ رشدی کے قتل کے فیصلہ میں ایران کی نام نہاد اسلامی حکومت تنہا ہے۔ بقیہ تمام مسلم ممالک، سرکاری سطح پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ رشدی نے اگرچہ انتہائی قابلِ اعتراض کتاب لکھی ہے، اس کے باوجود یہ صحیح نہیں کہ مذہبی فتویٰ جاری کر کے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اکسایا جائے کہ اس کو جہاں پائیں قتل کر دیں۔ سلمان رشدی کا جواب ہمیں پُرامن ذرائع سے دینا چاہیے نہ کہ بم اور گولی سے۔

ایک مغالطہ

سلمان رشدی کے بارے میں قتل کی وکالت کرنے والے جو مضامین شائع ہوئے، ان میں عام طور پر یہ الفاظ تھے کہ رشدی نے دنیا کے ایک بلین مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔ یہ الفاظ بلاشبہ خلاف واقعہ ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جتنے خطوط اور مضامین چھپے ہیں وہ ۹۹ فی صد سے زیادہ ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان کے "اُردو خواں" مسلمان ہیں جنھوں نے اس معاملہ میں پُرشور حصہ لیا۔ حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں جو مظاہرے ہوئے ہیں وہ بھی عملاً وہاں بسنے والے ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں کی طرف سے تھے۔ ان ملکوں میں عرب ممالک یا دوسرے ملکوں کے جو مسلمان آباد ہیں انھوں نے اس میں عملاً اتنا کم حصہ لیا ہے کہ وہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔

مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۳ اپریل ۱۹۸۹) میں آخری صفحہ کے نیچے ایک خبر ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ برطانیہ میں شیطانی آیات کے خلاف شورش تیز تر:

Anti-Verses stir intensified in UK

خبر میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ کے مسلمانوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ شیطانی آیات کے خلاف ایجی ٹیشن کو تیز تر کر دیں۔ حتیٰ کہ اس معاملہ میں وہ برطانی قانون کو توڑ کر بھی اپنی مہم کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد خبر میں بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر کلیم صدیقی نے مسلم انسٹی ٹیوٹ کے تحت ہونے والی

ایک کانفرنس میں اس بات کا اعلان کیا۔ یہ ڈاکٹر کلیم صدیقی کون ہیں۔ یہ ہندستان کے ایک "اردو داں" مسلمان ہیں جو ہندستان سے جاکر لندن میں آباد ہو گئے ہیں۔ (۱۸ اپریل ۱۹۹۶ کو ان کا انتقال ہو گیا)

۲۸ مئی ۱۹۸۹ کو رشدی کی کتاب کے خلاف لندن میں مظاہرہ کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۲۰ ہزار مسلمان اس میں شریک تھے۔ ان لوگوں نے تشدد اور توڑ پھوڑ بھی کیا۔ یہ مظاہرہ بھی برصغیر ہند کے ان لوگوں کی طرف سے تھا جو انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ اس کے لیڈر معین الدین چودھری تھے جو اصلاً بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ (قومی آواز ۲۹ مئی ۱۹۸۹)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو بیرونی ملکوں میں مسلمانانِ عالم کے نام پر اس احتجاجی مہم کی قیادت کر رہے ہیں۔ یہ دراصل ہندستان اور پاکستان کے کچھ مسلمان ہیں نہ کہ ساری دنیا کے مسلمان۔

اس سلسلہ میں جو خبریں آتی رہی ہیں ان میں اب تک عرب یا ترکی یا ملیشیا یا انڈونیشیا جیسے ملک کے لوگوں کا نام نہیں آیا ہے جو اس قسم کے مظاہرے اور ایجی ٹیشن میں سرگرم حصہ لے رہے ہوں۔ حتیٰ کہ خود ہندستان، پاکستان میں بھی صرف وہ لوگ اس مہم میں آگے ہیں جن کو ہم نے "اُردو داں" مسلمان کہا ہے۔ خود اس علاقہ کے غیر اُردو داں (مثلاً جنوبی ہند کے مسلمان) اب تک اس مہم میں کسی قابل لحاظ حیثیت میں شریک نہیں ہوئے۔ یہ واقعہ ثابت کر رہا ہے کہ یہ مہم سارے عالم اسلام کی مہم نہیں ہے۔ بلکہ عالم اسلام کی ایک محدود اقلیت کی مہم ہے جس نے غیر واقعی طور پر اپنے آپ کو اسلام کا واحد ٹھیکیدار سمجھ لیا ہے۔

مضحکہ خیز ردِّ عمل

سلمان رشدی کی کتاب بلاشبہ لغو ہے (ملاحظہ ہو، "سورج پر خاک") مگر شیعہ اور سنّی علماء کا مذکورہ ردِّ عمل بلاشبہ اس سے بھی زیادہ لغو ہے۔ سلمان رشدی نے اگر پیغمبر اسلام کی توہین کی تھی تو آیت اللہ خمینی اور ان کے ہم نوا علماء اسلام کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انھوں نے دنیا کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ وہ ایک وحشی اور غیر مہذب دین ہے۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب سیکولرزم کے نام پر لکھی تھی مگر شیعہ اور سنّی علماء اپنا ردِّ عمل اسلام کے نام پر ظاہر کر رہے ہیں۔ رشدی نے سیکولرزم کو بدنام کیا تھا، شیعہ اور سنّی علماء نے اسلام کو ساری دنیا میں بدنام کر دیا۔

توہین رسولؐ (شتم رسول) پر فقہا نے جو سزا مقرر کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب بھی کسی کو محسوس ہو کہ فلاں شخص نے پیغمبر کی توہین کی ہے تو وہ فوراً بندوق ہاتھ میں لے اور وہاں پہنچ کر اسے گولی مار دے۔ اسلام میں جرم کا معاملہ ایک عدالتی معاملہ ہے۔ یعنی مجرم کو عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا اور عدالتی کارروائی کے بعد اس پر ضروری فیصلہ کا نفاذ کیا جائے گا۔ عدالتی کارروائی کے بغیر اگر کوئی شخص کسی مجرم کو سزا دینے لگے تو یہ ایک سرکشی کا فعل ہے نہ کہ اسلام کا فعل۔

مزید یہ کہ توہین رسول کی سزا کا معاملہ کوئی مطلق معاملہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی شخص توہین رسول کا مرتکب ہو تو لازماً اس کو قتل کر دیا جائے یا اس کے قتل پر انعام کا اعلان کر دیا جائے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں ایسا کبھی نہیں کیا گیا۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم قائدین ہیں جو اس قسم کے بیانات جاری کر کے اسلام کو دنیا کی نظر میں مضحکہ بنا رہے ہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سرکشی ہے نہ کہ اسلام کی تعمیل۔

سطحی کتاب

جن لوگوں نے بھی سلمان رشدی کی کتاب کو پڑھا ہے، وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) بلاشبہ ایک سطحی اور عامیانہ کتاب ہے۔ اس میں قاری کے لیے کوئی کشش نہیں۔ نہ صرف یہ کتاب غیر معیاری (Sub-standard) ہے۔ بلکہ خود اس کا مصنف سلمان رشدی انگریزی کا کوئی معیاری ادیب نہیں۔ برطانیہ کے مشہور ادبی ناقد آبرون واف (Auberon Waugh) نے کہا ہے کہ سلمان رشدی اس قابل ہے کہ اپنی خراب انگلش کی بنا پر اس کو سزا دی جائے:

Mr. Salman Rushdie deserves to be punished for bad English.

خود مغرب کے سنجیدہ تبصرہ نگاروں نے اس ناول کے بارہ میں اس قسم کے الفاظ کہے ہیں بوجھل، ناقابل فہم، ناقابل مطالعہ: Dense, impenetrable, un-readable.

مسٹر خوشونت سنگھ نے رشدی کی کتاب کے بارہ میں کہا کہ ایک ناول کی حیثیت سے بھی "شیطانی آیات" مطالعہ کے لائق نہیں:

Even as a novel '*The Satanic Verses*' is not readable.

ایک اور ہندستانی جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ــــــ تیسرے درجہ کی تھیم، دوسرے درجہ کا مصنف اور اول درجہ کا کاغذ :

Third rate theme
by a second rate author
on a first rate paper.

کتاب کا یہ سطحی اور ناقص معیار مقتضی تھا کہ اس کو ایک جاہل کی جہالت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح یہ کتاب اپنی موت آپ مر جاتی۔ ریاض کے عربی ہفتہ وار الدعوۃ (۱۵ رمضان ۱۴۰۹ھ، ۲۰ اپریل ۱۹۸۹) میں دکتور عبد الکریم محمد الحسن بکار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کتاب پر بہترین تنقید یہ تھی کہ اس سے اعراض برتا جائے (کان خیر نقد لہ ھو الاعراض عنہ، صفحہ ۴۷) اسی طرح اُردن کے صالح القاسم نے لکھا ہے کہ ماضی میں بے شمار کتابیں اسلام کے خلاف لکھی گئیں۔ مگر علماء اسلام نے ان کو نظر انداز کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اپنی ساری عظمت کے ساتھ زندہ رہا اور یہ کتابیں گوشۂ اہمال میں جا کر ختم ہو گئیں۔ اگر اہمال و اعراض کا یہی طریقہ سلمان رشدی کی کتاب کے ساتھ اختیار کیا جاتا تو وہ بھی فراموشی کی تاریکی میں گم ہو کر ختم ہو جاتی (صفحہ ۳۹)

کتاب کا مضمون

سلمان رشدی کی کتاب کا نام (شیطانی آیات) ایک جھوٹی کہانی پر مبنی ہے۔ یہ جھوٹی کہانی ۵ نبوی میں اس وقت گھڑی گئی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ النجم نازل ہوئی (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : فرضی کہانی) کہانی کے یہ ابتدائی مصنفین عین اسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے جس کا ارتکاب سلمان رشدی نے اپنی کتاب شیطانی آیات لکھ کر کیا ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے اصحاب نے ان کے اوپر وہ سزا نافذ نہیں کی جس کا اعلان آج ایران کے شیعہ عالم اور ہندستان کے سنّی عالم مبینہ طور پر کر رہے ہیں۔ اگر اس جرم کی سزا لازمی طور پر وہی ہے جس کی موجودہ علماء وکالت کر رہے ہیں تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو مکہ میں اس کا نفاذ کرنا چاہیے تھا۔ مگر ثابت شدہ طور پر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ علماء کے اعلان کا ماخذ ان کی اپنی خواہشات ہیں نہ کہ قرآن اور سنّت۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے لیے ایک توہین آمیز نام

محاوند (Mahound) کا استعمال کیا ہے۔ یہ نام بلاشبہ اشتعال انگیز حد تک لغو ہے۔ انگریزی میں ہاونڈ کا لفظ کتے کے لیے استعمال ہوتا ہے، مَ انگریزی لفظ مائی (My) کا مخفف ہے۔ اس طرح محاونڈ کا دوسرا مطلب (نعوذ باللہ، نقل کفر کفر نباشد) ہے میرا کتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بے ہودہ نام سلمان رشدی کی ذاتی ایجاد نہیں ہے۔ یہ کروسیڈس (۱۰۹۶ ـ ۱۲۷۱) کے بعد یوروپ میں گھڑا گیا۔ یوروپ کی مسیحی قومیں جب دوسو سالہ صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکام ہوگئیں تو انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام کرنے کے لیے بہت سی پست حرکتیں کیں۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے آپ کے نام کو طرح طرح سے بگاڑا۔ ایک بگڑا ہوا نام یہ لفظ (Mahound) ہے۔ مگر پچھلے سات سو سال کے اندر اس گستاخی کی بنیاد پر کسی کو بھی قتل کی سزا نہیں دی گئی۔ اور نہ اس قسم کا فتویٰ جاری کیا گیا۔

سلمان رشدی نے جس کہانی کی بنیاد پر اپنی کتاب کا نام شیطانی آیات رکھا ہے، وہ کہانی سب سے پہلے ۵ھ نبوی میں مکہ میں وضع کی گئی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واضعین کو قتل نہیں کرایا۔ سلمان رشدی نے پیغمبر اسلام کے لیے جو گستاخانہ نام "محاونڈ" استعمال کیا ہے، وہ صلیبی جنگوں کے بعد کے دور میں یورپ میں وضع کیا گیا۔ مگر اس وقت کے علماء اسلام نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جن لوگوں نے یہ گستاخانہ نام وضع کیا ہے، انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا جائے۔

ازواج مطہرات کے خلاف جو بے ہودہ باتیں سلمان رشدی نے لکھی ہیں، اس کا مصنف اول مدینہ کا عبد اللہ بن ابی تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے اصرار کے باوجود اس کو قتل کرنے سے منع کر دیا۔ اٹلی کے دانتے (۱۲۶۵ء ـ ۱۳۲۱) نے ڈیوائن کمیڈی میں، نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ، نقل کفر کفر نباشد، نبی پاک کو جہنم میں دکھایا ہے۔ ترکی کی عثمانی سلطنت کا بانی سلطان عثمان غازی (۱۲۵۸ ـ ۱۳۲۶) دانتے کا ہم عصر تھا۔ مگر اس نے یہ فرمان جاری نہیں کیا کہ جو شخص دانتے کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو اتنا سنہری سکہ انعام دیا جائے گا۔ شیکسپیر (۱۵۶۴ ـ ۱۶۱۶) نے اپنے ڈرامے میں پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ جھوٹا رسول بتایا ہے۔ شاہ جہاں (۱۵۹۲ ـ ۱۶۶۶) شیکسپیر کا معاصر تھا۔ مگر ہندستان کے علماء نے شاہ جہاں سے یہ نہیں کہا کہ فوراً ایک یا زیادہ آدمی کو ہتھیار دے کر انگلینڈ بھیجو، تاکہ وہ وہاں پہنچ کر شیکسپیر کو قتل کر دیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس اعراض کی وجہ ماضی کے اہل ایمان یا سلاطین کی بے غیرتی نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قسم کی باتوں کو کتے کی بھونک سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو اس کا زیادہ بہتر اور کارگر جواب یہ ہے کہ ہاتھی اس کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ جائے۔

مسلّمہ عظمت

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود (الاسراء ۷۹) پر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی نبوت علمی اور تاریخی اعتبار سے مکمل طور پر ایک تسلیم شدہ نبوت ہے۔ آپ کی حیثیت نبوت ابدی طور پر سارے عالم کے لیے مسلّم ہو چکی ہے۔ ایسے پیغمبر کے خلاف ہر پروپگنڈا جھوٹا پروپگنڈا ہے، اور جھوٹا پروپگنڈا کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔

اگر کوئی شخص کہے کہ "ہمالیہ پہاڑ محض ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے" تو دنیا میں کوئی ایک شخص نہ ہوگا جو اس قول کو سن کر ہمالیہ پہاڑ کی عظمت کے بارہ میں مشتبہ ہو جائے۔ اسی طرح پیغمبر اسلام کے خلاف کوئی مضمون یا کتاب کسی بھی درجہ میں آپ کی شان کمال میں کوئی کمی نہیں کرتی۔

یہاں وضاحت کے لیے ایک مثال نقل کی جاتی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۴ فروری ۱۹۸۹) میں نئی دہلی کی ایک مسلم خاتون مسز زاہدہ خان کا تفصیلی خط چھپا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ میری ایک رشتہ دار خاتون باہر رہتی ہیں۔ وہ ہندستان آئیں تو اپنے ساتھ سلمان رشدی کی کتاب (*The Satanic Verses*) بھی لے آئیں۔ ان سے لے کر میں نے اس کتاب کو پڑھا۔ مگر میں آپ کو اور اپنی کمیونٹی کے رہنماؤں کو یہ یقین دلاتی ہوں کہ پیغمبر اسلام کے بارہ میں میرا عقیدہ اس کو پڑھنے سے کچھ بھی کم نہیں ہوا، بلکہ میرے یقین میں اور اضافہ ہو گیا:

> The offending book was brought to India by a visitor, and during her stay here, I read it. But I would like to assure you and leaders of my community that my faith in the Prophet Mohammad has been strengthened thereby (p.8).

جس پیغمبر کی عظمت اتنی مسلّم ہو، اس کے خلاف کوئی بیان دیکھ کر اگر مسلمان مشتعل ہوں تو وہ صرف اپنے چھوٹے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر کی عظمت و شان میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

سورج پر خاک

سلمان رشدی بمبئی میں پیدا ہوئے۔ اب وہ اپنی برطانی بیوی میریانے وگنس (Marianne Wiggins) کے ساتھ لندن میں رہتے ہیں۔ ان کی کئی انگریزی کتابیں (ناولیں) اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور کتاب آدھی رات کے بچے (Midnight's Children) ہے جو ۱۹۸۱ میں شائع ہوئی ہے۔ حال میں ان کی ۵۴۷ صفحات کی ایک کتاب ایک برطانوی پبلشر وائکنگ پریس (Viking Press) نے شائع کی ہے جو لندن سے ۲۶ ستمبر ۱۹۸۸ کو ریلیز کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام "شیطانی کلام" (The Satanic Verses) ہے۔

مصنف نے کتاب کا نام (شیطانی کلام) بطور خود اس کے اساسی کردار "محاونڈ" (Mahound) کی نسبت سے استعمال کیا ہے جو کہ نعوذ باللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کتاب کا یہ نام کتاب کے مفروضہ کردار کے بجائے خود کتاب کے مصنف کے اوپر زیادہ صحیح طور پر چسپاں ہوتا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنے ایک بیان (ٹائمس آف انڈیا ۸ اکتوبر ۱۹۸۸) میں کہا ہے کہ یہ کتاب مذہب اور الہام کے بارے میں ایک سیکولر آدمی کا نقطۂ نظر بیان کرنے کی ایک کوشش ہے:

> Its's an attempt to write about religion and revelation from the point of view of a secular person.

مگر زیادہ صحیح بات یہ ہوگی کہ یہ کہا جائے کہ وہ ایک سیٹانک پرسن (Satanic person) کے نقطۂ نظر کو بیان کرنے کی کوشش ہے۔ کیوں کہ سیکولرزم، یا سیکولر انسان کا یہ مطلب کسی بھی سنجیدہ صاحب علم نے کبھی نہیں بتایا جس کا نمونہ سلمان رشدی نے اپنی مذکورہ کتاب میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ایک انتہائی بیہودہ اور فحش قسم کا ناول ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس میں حمزہؓ اور عائشہؓ وغیرہ کے نام تو بالکل اصل حالت میں درج کئے گئے ہیں، البتہ پیغمبر کا نام محمدؐ کے بجائے محاونڈ (Mahound) لکھا گیا ہے۔ یوروپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے قدیم زمانہ میں اپنے جذبۂ عناد کی تسکین کے لئے آپ کے نام کو طرح طرح

سے بگاڑا تھا۔ انھیں میں سے ایک بگڑا ہوا نام وہ ہے جس کو سلمان رشدی نے انتہائی مجرمانہ طور پر اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نسل انسانی کی بزرگ ترین شخصیت ہیں۔ آپ کی ذات گرامی بلاشبہہ پوری انسانیت کے لئے فخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی عظمت اور آپ کا تقدس اتنا زیادہ مسلّم ہے کہ دنیا کے تمام سنجیدہ لوگوں نے متفقہ طور پر اس کا اقرار کیا ہے۔

آپ کا ایک خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ابدی طور پر فتح و غلبہ کی نسبت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ قدیم عرب میں ہر قسم کی شدید ترین مخالفت کے باوجود آپ تمام قبائل کے اوپر مکمل طور پر غالب رہے۔ آپ کے زمانہ کی دو طاقت ور ترین سلطنتیں (روم اور ایران) آپ سے ٹکرائیں مگر وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئیں۔ آپ کے ظہور کے بعد یہودی اور عیسائی ساری دنیا میں آپ کے دشمن ہو گئے، مگر وہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔

صلیبی جنگوں کے بعد یوروپ کی مسیحی اقوام نے متحدہ طور پر یہ کوشش کی کہ وہ آپ کی تصویر کو بگاڑیں اور آپ کی تاریخ کو بالکل مسخ کر ڈالیں۔ مگر ہزار برس تک اپنی ساری طاقت خرچ کرنے کے باوجود ان کی کوششیں صد فی صد ناکام ہو گئیں۔ یہاں تک کہ سائنس کے زیر اثر خود علم انسانی میں وہ انقلاب آیا جس نے آپ کے معاندین کے پیدا کردہ لٹریچر کو غیر حقیقی قرار دے کر رد کر دیا۔ خود مسیحی طبقہ کی بعد کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی ابتدائی نسلوں کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ان میں ٹامس کارلائل پیدا ہوا جس نے آپ کو تمام پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا (۱۸۴۰) ان کے درمیان سے مائیکل ہارٹ اٹھا جس نے یہ اعلان کیا کہ محمدؐ تاریخ کے واحد سب سے بڑے انسان تھے (۱۹۷۸) وغیرہ۔

جو ہستی اتنی عظیم ہو اور جس کی بڑائی ایسا مسلّمہ واقعہ بن چکی ہو، اس کے خلاف کتاب لکھنا یا اس کی شان میں برے کلمات اپنی زبان سے نکالنا یقیناً ایسا ہی ہے جیسا سورج کے اوپر خاک ڈالنا۔ جو شخص سورج کے اوپر خاک ڈالنے کی کوشش کرے وہ خود اپنے منھ میں خاک ڈال رہا ہے، وہ خود اپنے آپ کو باطل ثابت کر رہا ہے۔

کتا اگر ہاتھی کے اوپر بھونکے تو ہاتھی کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کتے کی بھونک کی

تردید کرے۔ ہاتھی اپنے باعظمت وجود کے ساتھ اپنے آپ کتّے کی بھونک کی تردید ہے۔ پیغمبر اسلام کی عظمت اس سے زیادہ ہے کہ کسی کے قلم کی سیاہی اس کو داغدار کر سکے۔ ساری تاریخ، تمام انسانی علوم، حتیٰ کہ پوری کائنات ایسی ہر کوشش کی تردید ہے۔ جس ہستی کے ظہور نے خود انسانی تاریخ کو بدل ڈالا ہو، کون ہے جو اس کی تصویر کو بدلے، کون ہے جو اس کی تاریخ کو مٹا سکے۔

فرضی افسانہ

سلمان رشدی (۴۲ سال) کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) جو ۵۴۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس پر نیویارک کے ہفت روزہ ٹائم (۱۳ فروری ۱۹۸۹) میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ نگار مسٹر پال گرے (Paul Gray) کا کہنا ہے کہ کتاب کے خلاف مسلمانوں کے عوامی احتجاجات (Public protests) غیر ضروری تھے۔ راقم الحروف خود بھی اس قسم کے احتجاج اور شور و غل کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ کتا اگر ہاتھی پر بھونکے تو ہاتھی کتے پر نہیں بھونکتا۔ کیوں کہ ہاتھی کی عظمت بذات خود کتے کی ہر بھونک کا جواب ہے۔ اور جب چپ کی زبان کافی ہو تو بولنے کی زبان استعمال کرنے کی کیا ضرورت۔

تاہم اس سلسلہ میں تبصرہ نگار نے جو توجیہہ کی ہے، اس توجیہہ سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ تاریخ کی جگالی (Rumination on history) ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ اصلاً تاریخی واقعات پر مبنی ہے، اور جب ایسا ہے تو اس کے خلاف ہنگامہ اور احتجاج کیوں۔ مگر یہ مفروضہ بذات خود واقعہ کے مطابق نہیں کہ کتاب میں جو باتیں درج ہیں ان کی بنیاد کسی تاریخی واقعہ پر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی افسانہ ہے اور اپنی تاریخی بنیاد کے اعتبار سے بھی افسانہ۔

تبصرہ نگار لکھتے ہیں کہ کتاب میں جبریل اور محمد کے درمیان تبادلۂ کلام، بظاہر بگڑے ہوئے اور خیالی انداز میں، ایک قصہ پر مبنی ہے جو محمد کی زندگی میں پیش آیا۔ پیغمبر ابتداءً اس پر راضی ہو گیے کہ عرب کی تین دیویوں کا اعتراف قرآن میں شامل کر دیں، اور بعد کو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ آیتیں شیطان کی الہام کی ہوئی تھیں۔ اگر محمد خود یہ اقرار کرنے کے لیے تیار تھے کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس قدیم گزرے ہوئے واقعہ کا مماسی اور افسانوی بیان آج کیوں اتنے ہنگامہ کا سبب بن جائے:

> The Gibreel-Mahound exchanges are based, in an obviously distorted and hallucinatory manner, on an episode in the life of Muhammad: the Prophet's early willingness to include in the Quran an acknowledgment of three female deities and his later repudiation of these verses as satanically inspired. If Muhammad himself was willing to admit that he had been deceived, it is difficult to see why a tangential, fictional version of this long-ago event should cause such contemporary furor (p. 42).

اس اقتباس میں جس "واقعہ" کا ذکر ہے، وہ سورہ النجم سے تعلق رکھتا ہے۔ متعلقہ آیتیں حسب ذیل ہیں :

افرأیتم اللات والعزیٰ۔ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ۔ الکم الذکر ولہ الانثیٰ۔ تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ (النجم ۱۹-۲۲)

کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور تیسرے ایک اور منات کو۔ کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہے۔

قدیم عرب میں تین بڑے بت تھے ـــــــ لات، عزیٰ، اور منات۔ ان بتوں کو اس زمانہ میں بہت بڑی چیز سمجھا جاتا تھا۔ ان بتوں کی بڑائی بیان کرنے کے لیے لوگوں نے طرح طرح کے کلمات وضع کر رکھے تھے۔ یاقوت الحموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے : واللّات والعزّیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ ھٰؤلاء الغرانیق العُلیٰ وانّ شفاعتھنّ لترتجیٰ (قسم ہے لات اور عزیٰ کی اور تیسرے منات کی۔ یہ سب بلند مرتبہ ہیں۔ ان کی سفارش ضرور متوقع ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں سورہ النجم کی مذکورہ آیتیں اتریں تو آپ نے حسب معمول ایک مجمع میں ان کو سنایا۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کچھ مشرک لوگ بھی موجود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جب یہ الفاظ نکلے : افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ تو بعض مشرکین نے اس میں اپنے الفاظ ملا دیئے۔ اپنے بتوں کے نام سن کر وہ فوراً وہ الفاظ بول پڑے جو ان بتوں کی نسبت سے پہلے سے ان کے یہاں رائج تھے اور جن کو وہ ان بتوں کے نام کے ساتھ جوڑ کر کہا کرتے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے : تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفاعتھن تُرتجیٰ۔

ان دوسرے الفاظ کا کوئی بھی تعلق پیغمبر اسلام سے نہ تھا۔ آپ نے تو صرف اول الذکر الفاظ (افرأیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ) فرمائے تھے۔ ثانی الذکر الفاظ (تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفاعتھن ترتجیٰ) تمام تر مشرکین کے الفاظ تھے جن کو انھوں نے آواز میں آواز ملا کر اپنی طرف سے کہہ دیا۔ یہی بات بعض مفسرین نے ان الفاظ میں کہی ہے :

ان الشیطان اوقع فی مسامع المشرکین ذٰلک فتوھموا انہ صدر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شیطان نے مشرکوں کے کان میں یہ الفاظ ڈال دیئے۔ پس مشرکوں نے گمان کر لیا کہ یہ خود رسول اللہ

وليس كذلك في نفس الامر بل انما كان من صنيع الشيطان لا من رسول الرحمٰن صلی اللہ علیہ وسلم (تفسیر ابن کثیر، الجزء الثالث، صفحہ ۲۳۰)

صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ وہ دراصل شیطان کا کلام تھا نہ کہ رسول رحمان کا کلام۔

یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات کسی نہ کسی شکل میں ہر شخص کے ساتھ ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً حکمراں پارٹی کا لیڈر ایک بار تقریر کر رہا تھا۔ مجمع میں اس کی پارٹی کے لوگ بھی تھے اور دوسری پارٹیوں کے لوگ بھی۔ تقریر کے دوران ایک بار لیڈر نے (بطور تنقید) مخالف پارٹی کے لیڈر کا نام لیا۔ مخالف پارٹی کے آدمیوں نے جب اپنے لیڈر کا نام سنا تو عین اسی وقت وہ "زندہ باد، زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے مخالف پارٹی کے لیڈر کے لیے زندہ باد کہا تو یہ غلط ہوگا۔ کیوں کہ حکمراں پارٹی کے لیڈر نے تو اس کا نام محض تنقید کے لیے لیا تھا، یہ دراصل مخالف پارٹی کے لوگ تھے جو اس کی آواز میں اپنی آواز ملا کر زندہ باد کے الفاظ بولنے لگے۔

واقعہ کی سادہ شکل وہی ہے جو اوپر نقل کی گئی۔ مگر اسلام کے کچھ مخالفوں نے اس واقعہ کو غلط صورت دے کر ایک خود ساختہ کہانی بنائی۔ انھوں نے مشرکین کے قول کو پیغمبر کا قول قرار دیدیا۔ اور کہا کہ پیغمبر اسلام پر سورۃ النجم اتاری جارہی تھی جب اس کا سلسلہ مناۃ الثالثۃ الاخریٰ تک پہونچا تو اس کے بعد شیطان نے مذکورہ الفاظ آپ پر القار کر دیئے۔ آپ نے قرآن کی آیت کے ساتھ اس کو ملا کر مجمع میں پڑھ دیا۔ بعد کو آپ کو غلطی کا احساس ہوا تو آپ نے اعلان کیا کہ مذکورہ کلام خدا کا کلام نہیں تھا۔ وہ شیطان کا کلام تھا۔ یہ کہہ کر اس کو قرآن سے حذف کر دیا۔

یہ ساری کہانی، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، بالکل لغو ہے، اور اس سے بھی زیادہ لغو بات یہ ہے کہ اس کو تاریخی حیثیت دے کر اس کی روشنی میں ایک پورا افسانہ بنایا جائے اور اس کی بنیاد پر پورے قرآن کو کلام خداوندی کے بجائے، نعوذ باللہ، کلام شیطانی قرار دینے کی کوشش کی جائے۔

قرآن کی صداقت کا بذات خود یہ کافی ثبوت ہے کہ معاندین اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی حقیقی دلیل نہیں پاتے۔ ان کے پاس اپنے معاندانہ جذبہ کی تسکین کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ بطور خود ایک جھوٹی کہانی بنائیں اور اس کو قرآن کی طرف منسوب کر کے قرآن کی سچائی کو ناکام طور پر داغدار کرنے کی کوشش کریں۔

غلط بیانی

انگریزی روزنامہ انڈین اکسپریس (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) میں اس کے ایڈیٹر مسٹر ارن شوری کے قلم سے ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کی سنسنی خیز سرخی یہ ہے ——— مگر خود آیات کے بارے میں کیا :

But what about the verses themselves?

اس مضمون میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ تاہم دوسری باتوں کو چھوڑتے ہوئے ہم اس کے صرف اس حصہ کے بارے میں کچھ عرض کریں گے جس کا تعلق براہ راست طور پر قرآن سے ہے۔ اس حصۂ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) پر حکومت نے جو پابندی لگائی ہے وہ اس لیے لگائی ہے کہ اس سے ایک فرقہ کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس منطق سے خود قرآن پر بھی پابندی لگائی جانی چاہیے کیوں کہ اس میں بھی ایسی آیتیں موجود ہیں جن سے دوسرے فرقوں کے لوگوں کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں یا مجروح ہو سکتے ہیں۔

یہ آیتیں کیا ہیں۔ یہ آیتیں وہ ہیں جو جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ارن شوری نے اس قسم کی کچھ آیتوں کو نقل کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ کافروں کو مارو، انھیں قتل کرو۔ اس طرح کی آیتیں واضح طور پر غیر مسلموں کے جذبات کو مجروح کرنے والی ہیں۔ اس لیے ان کے خیال کے مطابق، خود قرآن پر بھی پابندی لگنا ضروری ہے۔

ارن شوری نے یہ بات آزادانہ تحقیق اور عقلی اظہار خیال (Rational discourse) کے نام پر کی ہے۔ مگر زیادہ صحیح یہ تھا کہ وہ اپنی اس بات کو خود ساختہ الزام یا غلط بیانی (Rational falsification) کا نام دیتے۔ کیوں کہ انھوں نے قرآن کی جو چند آیتیں پیش کی ہیں وہ سب سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ایک ایسا خود ساختہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی ہے جو خود آیتوں کے اندر موجود نہیں۔ یہاں ہم نمونے کے طور پر ان کے پیش کردہ حوالوں میں سے دو بنیادی حوالوں کا ذکر کریں گے۔

سورہ البقرہ کی دو آیتوں کے جزئی حصہ کا ترجمہ (انگریزی میں) انھوں نے اس طرح نقل کیا ہے: اور ان کو نکالو جس طرح انھوں نے تم کو نکالا ہے، اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے (۱۹۱) اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے (۱۹۳)

اس طرح جنگ سے متعلق چند آیتیں نقل کرنے کے بعد انھوں نے سورۂ الاحزاب کی ایک آیت کا ترجمہ (انگریزی میں) اس طرح دیا ہے: اور کسی مومن اور مومنہ کے لیے گنجائش نہیں جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیدیں کہ پھر ان کو اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (۳۶)

اس طرح کے کچھ اقتباسات نقل کر کے مضمون میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن غیر مسلموں کو مارنے اور انھیں قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور جب خدا کا حکم آجائے تو قرآن کے مطابق، مومنین قرآن پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ بے چون وچرا اس کی تعمیل کریں۔ یعنی تلوار لے کر اٹھیں اور غیر مسلموں کو ایک طرف سے مارنا شروع کر دیں۔

ارن شوری کی اس لغو تشریح کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سراسر ایک خود ساختہ تشریح ہے جو ناقص اقتباسات کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ یہ بات اس وقت نہایت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے جب کہ مذکورہ آیات کو ان کے سیاق (Context) میں رکھ کر دیکھا جائے۔

۱۔ سب سے پہلے سورۃ البقرہ کو لیجئے۔ اس کے جس حصہ سے مذکورہ الفاظ لیے گیے ہیں، اس پورے حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑائی کرتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو جب تک کہ وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں، پس اگر وہ تم سے جنگ چھیڑیں تو ان سے جنگ کرو، یہی سزا ہے انکار کرنے والوں کی۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ (Persecution) باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر (۱۹۰-۱۹۳)

مذکورہ آیت میں " ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں " (وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم) کے الفاظ ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں دفاع (Defence) کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ جنگ کا۔ یعنی یہ کوئی مطلق یا عمومی ہدایت نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اس ہنگامی صورت حال سے ہے جب کہ کچھ لوگوں نے جارحیت کا آغاز کر کے اہل ایمان کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہو۔ گویا کہ یہ دفاع کی آیت ہے نہ کہ قتال کی آیت۔ آیت کے اس ٹکڑے کا صحیح انگریزی ترجمہ یہ ہوگا :

And fight in the way of God those who fight you (2:190),

اب مسٹر ارن شوری یا ان کے ہم خیال لوگ بتائیں کہ دنیا کا کون سا قانون یا کون سا بین اقوامی رواج ہے جو دفاع کو قابل اعتراض قرار دیتا ہے۔ مسٹر ارن شوری کو اگر ہندستان کا پرائم منسٹر بنا دیا جائے تو کیا وہ ایسا کریں گے کہ وزارت دفاع کا شعبہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ کیا وہ بری، بحری، اور ہوائی افواج کے تمام لوگوں کو ریٹائر کر کے گھر بھیج دیں گے۔ ملک کے بچاؤ کے لیے جو ہتھیار جمع کیے گیے ہیں ان کو وہ بحر ہند میں پھنکوا دیں گے اور ملک میں فوجی سامان تیار کرنے کے جتنے کارخانے ہیں ان سب کو تبدیل کر کے انھیں کھیل اور تفریح کا کلب بنا دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے اور یقیناً نہیں کریں گے تو انھیں کیا حق ہے کہ قرآن کے ایک ایسے حکم پر اعتراض کریں جو دنیا کے تمام قوانین اور تمام بین اقوامی رواج کے مطابق عین درست ہے اور مسلمہ طور پر ایک جائز حق ہے۔ یعنی جارحانہ کارروائی کے خلاف دفاع کا حق۔

۲۔ اب دوسری سورہ (الاحزاب) کے اقتباس کو لیجیے۔ اس آیت کا پورا ترجمہ یہ ہے : اور کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا (۳۶)

سورۃ الاحزاب کی یہ آیت جس سلسلۂ بیان میں آئی ہے، اس کا قطعاً کوئی تعلق جنگ سے نہیں ہے۔ یہ آیت دراصل ایک معاشرتی اصلاح کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

مدینہ میں ایک خاتون تھیں جن کا نام زینب بنت جحش تھا۔ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۳ھ میں ان کے یہاں زید بن حارثہ کے لیے نکاح کا پیغام دیا جو ایک آزاد کردہ غلام تھے۔ یہ بظاہر ایک نابرابری کا رشتہ تھا۔ چنانچہ زینب بنت جحش اور ان کے گھر والوں نے اس کو نامنظور کر دیا، خود زینب نے کہا کہ میں زید سے نسب میں بہتر ہوں (انا خیر منہ حسبًا)

زینب اور ان کے گھر والے سب کے سب مسلمان تھے۔ انھوں نے حسب نسب کے فرق کی بنیاد پر اس رشتہ کو ماننے سے انکار کیا تھا جو قرآنی اسکیم کے سراسر خلاف تھا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتری۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسلام کی شریعت خدا کے احکام پر مبنی ہے نہ کہ قومی اور خاندانی رواج پر۔ اگر تم واقعۃً اللہ اور رسول کے مومن ہو تو تمہیں وہی کرنا چاہیے جس کا حکم خدائی شریعت میں دیا گیا ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس آیت کے اترتے ہی زینب اور ان کے گھر والوں نے خاندانی نخوت کو ترک کر دیا اور خدا کے حکم کے مطابق زید بن حارثہ سے نکاح پر راضی ہو گیے (فامتنعت ثم اجابت)

اصل پس منظر کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ آیت ایک عظیم سماجی انقلاب کا عنوان ہے جب کہ تاریخ میں پہلی بار مصنوعی اونچ نیچ کو ختم کر کے حقیقی انسانی مساوات کو قائم کیا گیا۔ قرآن کی یہ آیت نہ صرف مومنین قرآن کے لیے بلکہ تمام قوموں کے لیے فخر کی آیت ہے۔ یہ آیت اس دن کو یاد دلاتی ہے جب کہ ہزاروں سال سے جکڑی ہوئی انسانیت کو جھوٹے بندھنوں سے آزادی حاصل ہوئی اور تاریخ میں وہ نیا عمل شروع ہوا جو موجودہ زمانہ میں مساواتِ انسانی کے عمومی اعتراف کے مرحلہ تک پہنچا۔

آدمی کے اندر اگر اعتراف کا حوصلہ ہو اور اس کو دیکھنے والی آنکھ حاصل ہو تو وہ اس آیت میں سچی انسانیت کی روشنی دیکھے گا، مگر جو لوگ بصیرت سے محروم ہوں، ان کے لیے تو اجالا بھی ویسا ہی تاریک ہے جیسا کہ اندھیرا:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ایک مثال

انڈین پینل کوڈ کی دفعہ ۹۶ سے لے کر دفعہ ۱۰۶ تک ذاتی دفاع کے بارے میں ہیں۔ اس کی دفعہ ۹۶ آدمی کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ اپنے دفاع (بچاؤ) میں لڑے۔ اگر کسی شخص پر جارحیت کی

جائے اور وہ اپنے دفاع میں دوسرے شخص پر حملہ کرے تو یہ قانونی اعتبار سے اس کے لیے جرم نہیں ہوگا :

Nothing is an offence which is done in the exercise of the right of private defence.

اب اگر کوئی شخص ان دفعات کو لے کر یہ کہنے لگے کہ ہندستان کا قانون ہر آدمی کو کھلی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف جس کو پائے اس کو مارنا شروع کر دے۔ تو ایسا شخص یقیناً غلطی کرے گا۔ کیوں کہ وہ خصوصی حکم کو عمومی حکم بنا رہا ہے۔ وہ دفاع کے حکم سے آزادی مذہب کا حکم نکال رہا ہے۔

ہندستان کا قانون مذہبی آزادی کے معاملہ میں کیا ہے، اس کو پینل کوڈ (قانون فوجداری) سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے دستور ہند کی وہ دفعہ دیکھنی ہوگی جو بنیادی حقوق (Fundamental rights) سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہندستان کے قانون نے مذہب کے معاملہ میں ہر آدمی کو پوری آزادی عطا کی ہے۔ اس کے مطابق، نہ کسی سے اپنی پسند کا عقیدہ رکھنے کا حق چھینا جا سکتا اور نہ اس معاملہ میں اس کو مجبور کیا جا سکتا۔

مسٹر ارن شوری نے یہی غلطی قرآن کو سمجھنے میں کی ہے۔ وہ قانون دفاع اور قانونِ مذہب کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کر رہے ہیں۔ انھوں نے قرآن سے "قتال" کی جو آیتیں نقل کی ہیں وہ سب دفاع کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی یہ کہ جارحیت کے وقت مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جہاں تک اس دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ مذہب کی آزادی کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے، اس سلسلہ میں مسٹر ارن شوری کو چاہیے کہ وہ قرآن کی ان آیتوں کا مطالعہ کریں جو خاص طور پر اس دوسرے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً :

۱۔ دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت (شیطان) کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے (البقرہ ۲۵۶)

۲۔ پس تم لوگوں کو نصیحت کرو، تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔ تم ان کے اوپر داروغہ نہیں ہو

(الغاشیہ ۲۱-۲۲)

قرآن میں اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جو واضح طور پر بتاتی ہیں کہ عقیدہ یا مذہب کا معاملہ تمام تر ذاتی ضمیر کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ جس عقیدہ یا جس مذہب کو چاہے مانے اور جب چاہے اپنے ذاتی فیصلہ سے اس کو بدل دے۔ مذہب کے معاملہ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں۔ مذہب کے معاملہ میں صرف تبلیغ ہے نہ کہ جبر۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی قانون جارحیت کے موقع پر ہر شخص یا قوم کو اپنے دفاع (بچاؤ) کا حق دیتا ہے۔ مگر جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے، وہ ہر ایک کے لیے مذہبی آزادی کا حق تسلیم کرتا ہے، "قتال" کے قرآنی حکم کا تعلق صرف پہلے معاملہ سے ہے، دوسرے معاملہ سے جنگ وقتال کا کوئی تعلق نہیں۔

اطاعت یا سرکشی

سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) میں نے خود پڑھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی لغو کتاب ہے۔ اس کتاب کی لغویت کے بارہ میں میری وہی رائے ہے جو دوسروں کی رائے ہے۔ مگر اس کتاب کے بارہ میں مسلمانوں کا ردِّ عمل کیا ہونا چاہیے، اس سلسلہ میں میری رائے ان لوگوں سے مختلف ہے جو یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ رشدی کو قتل کر کے اسے جہنّم رسید کرو۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں جو کچھ کہا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ تمام باتیں نہ صرف پچھلے ہزار سال سے کسی نہ کسی شکل میں کہی جاتی رہی ہیں، بلکہ یہ خود اس زمانہ میں بھی کہی گئی تھیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں موجود تھے۔ اس وقت آپ نے ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، اس کو معلوم کر کے ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ اسی قسم کے موجودہ واقعہ میں ہم کیا طرزِ عمل اختیار کریں۔ اس معاملہ میں کسی اجتہاد یا قیاس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پیغمبرِ اسلام کا اسوہ (نمونہ) واضح طور پر ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔

چند مثالیں

۱۔ سلمان رشدی کی کتاب میں ایک بات نعوذ باللہ یہ کہی گئی ہے کہ قرآن میں جبریلؑ کی لائی ہوئی آیتوں کے ساتھ شیطان کی القا کی ہوئی آیتیں بھی شامل تھیں۔ اسی بنا پر اس نے اپنی کتاب کا نام "شیطانی آیات" رکھا ہے۔ یہ نام زیادہ صحیح طور پر خود رشدی کی کتاب پر صادق آتا ہے۔ تاہم اس نے اپنے خیال کے مطابق، یہ نام قرآن کو دینا چاہا ہے۔

سلمان رشدی نے اپنا یہ نظریہ اس قصہ کی بنیاد پر کھڑا کیا ہے جس کو غرانیق کا قصہ کہا جاتا ہے۔ یہ قصہ، جس کی تفصیل دوسرے مضمون میں بتائی گئی ہے، اس وقت گھڑا گیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں تھے اس لغو قصہ کے ابتدائی مصنف مکہ کے مشرکین تھے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ان مشرکوں کے اوپر آپ کو مکمّل قابو حاصل ہو گیا۔ مگر آپ نے یہ

اعلان نہیں فرمایا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے غرانیق کا جھوٹا قصہ گھڑا تھا، انہیں قتل کر کے ان سب کو جہنّم رسید کر دو۔ اس کے برعکس آپ نے ان سے فرمایا کہ اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اسلام کی نظریاتی طاقت پر بھروسہ کیا، نہ کہ اسلام کی شمشیری طاقت پر۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ اگرچہ آپ نے ان پر تلوار استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام کی نظریاتی طاقت نے ان کو مسخر کر لیا۔ ان کو آزادی دینے کے جلد ہی بعد وہ اسلام کے عقیدہ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق سے اتنا متاثر ہوئے کہ کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے خدا کی غلامی میں دے دیا۔

۲۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ماونڈ (Mahound) لکھا ہے۔ یہ ایک استہزائی نام ہے۔ جس طرح بعض لوگ وہابی کو وہابڑا اور دیوبندی کو دیو کے بندے وغیرہ کہتے ہیں، اس طرح سلمان رشدی نے آپ کے لیے اس بگڑے ہوئے نام کو استعمال کیا ہے جو صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے عیسائیوں نے آپ کے لیے گھڑا تھا۔

اس مجرمانہ حرکت کی مثال بھی زمانۂ نبوت میں موجود ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اگرچہ آپ کے دادا عبد المطلب نے محمد رکھا تھا، مگر مکہ کے قریش نے استہزائی طور پر آپ کا نام مذمّم رکھ دیا۔ محمد کے معنی ہیں تعریف کیا ہوا۔ جبکہ مذمّم کے معنی ہیں مذمّت کیا ہوا۔ ابو لہب کی بیوی ام جمیل شاعرہ تھی۔ اس نے مذمّم کے لفظ کو لے کر شعر کہا تھا اور اس کو اس طرح پڑھا کرتی تھی:

مذمما عصینا، وامره ابینا، ودینه قلینا

ہم نے ایک قابلِ مذمّت شخص کی نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

اس معاملہ میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے یہ فرمایا ہو کہ دیکھو فلاں لوگ میرا نام بگاڑ کر مجھ کو مذمّم کہتے ہیں، ان سب کو قتل کر دو۔ اس کے

برعکس جو ہوا، وہ تاریخ کے الفاظ میں یہ ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کا نام مذمّم رکھتے تھے۔ اور پھر اسی نام سے آپ کو گالی دیتے تھے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ یہ فرماتے تھے کہ کیا تم لوگوں کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی ایذا رسانی کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو گالی دیتے ہیں اور مذمّم کہہ کر میری ہجو کرتے ہیں۔ حالانکہ میں محمد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔

قال ابن اسحاق۔ وکانت قریش انما تسمی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مذمما ثم یسبونہ۔ فکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول: الا تعجبون لما صرف اللہ عنی من اذی قریش یسبون ویھجون مذمما وانا محمد

(سیرۃ ابن ھشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۷۹)

یہاں دوبارہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بگاڑ کر آپ کو اذیت پہنچائی جاتی ہے۔ مگر آپ اپنے اصحاب سے یہ نہیں کہتے کہ یہ لوگ ناقابلِ معافی جرم کے مجرم ہیں، ان سب کو ایک ایک کر کے قتل کر دو۔ اس کے برعکس آپ اپنے اصحاب کی توجہ قولِ انسانی سے ہٹا کر قولِ خداوندی کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ انسان اگر میری مذمّت کرتے ہیں اور میرا سب وشتم کر رہے ہیں تو اس سے کیا ہوا۔ تمام انسانوں کے رب اور ساری کائنات کے مالک نے ابدی طور پر مجھے محمد کے مقامِ اعلیٰ پر فائز کر دیا ہے۔ پھر ان کی بے ہودہ گوئی کی پرواکرنے کی مجھے کیا ضرورت۔

۳۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں ایک اور نہایت بے ہودہ حرکت یہ کی ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ کو نعوذ باللہ ایک بدکردار خاتون کے روپ میں دکھایا ہے۔ یہ بلاشبہ اشتعال انگیز حد تک ایک بے ہودہ بات ہے۔ کوئی مسلمان کتاب کے اس حصہ کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔

مگر یہاں بھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ امہات المومنین کی کردارکشی کا یہ جرم پہلی بار رشدی کی کتاب میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ شنیع جرم اس سے پہلے خود زمانۂ رسالت میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرے مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ کس طرح صفوان بن معطّل کے ایک واقعہ کو

شوشہ بنا کر مدینہ کے کچھ منافقین نے یہ جھوٹا افسانہ گھڑا۔ اور اس کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کی۔

یہ افسانہ اس وقت اتنا زیادہ پھیلایا گیا کہ کئی مخلص مسلمان تک اس سے متاثر ہو گئے۔ ایک مہینہ تک مدینہ کی پوری فضا شرمناک افواہوں سے بھری رہی۔ یہ تکلیف دہ صورتِ حال صرف اس وقت ختم ہوئی جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے مداخلت فرمائی۔ اور قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے۔ وہ محض جھوٹا پروپیگنڈہ ہے نہ کہ کوئی واقعی حقیقت۔

مگر اس وقت بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام لوگوں کے قتل کا حکم دے دیں جو کردار کشی کی اس جھوٹی مہم میں ملوث تھے۔ کچھ صحابہ نے ایسے افراد کو قتل کرنے کی پیش کش کی۔ مگر آپ نے اس پیش کش کو قبول نہیں فرمایا۔ امہات المومنین کی کردار کشی کے ان مجرمین کو زندہ چھوڑ دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت مرے۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے آخری حساب کے لیے پہنچا دیے گئے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ الزام کی طاقتور تردید کر کے مجرمین کو چھوڑ دیا جائے تاکہ لوگ ساری عمر ان کی لعنت کریں، اور پھر مر کر وہ اللہ کی عدالت میں پہنچا دیے جائیں تاکہ وہ اپنے خلاف ابدی لعنت کا فیصلہ سنیں اور ہمیشہ کے لیے رسوائی کے گڑھے میں پڑے رہیں۔

یہ ہے اس طرح کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ۔ اب اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب سے ہمارے جذبات مجروح ہوئے ہیں، اور ہم تو اس کو قتل کر کے رہیں گے، تو میں کہوں گا کہ "مسلمانوں کے جذبات کا مجروح ہونا" اسلام کے قانونِ جرائم کی کوئی دفعہ نہیں ہے۔ مسلمان اگر اس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کر سکتے ہیں۔ مگر اسلام کے نام پر انہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اسلام کے نام پر اس قسم کا فعل کریں تو انہیں ڈرنا چاہیئے کہ ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش میں وہ خود اپنے آپ کو اللہ کی نظر میں زیادہ بڑا مجرم نہ بنالیں۔ موجودہ حالات میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان صرف اپنے نفس کی پیروی کر رہے ہیں نہ کہ خدا اور رسول کی پیروی۔

تعمیل حکم یا سرکشی

سلمان رشدی کے قتل کے نعرہ پر مسلمانوں نے جو دھوم مچائی، وہ حقیقتاً نفسانیت اور سرکشی تھی نہ کہ شریعت خداوندی کی تعمیل۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس معاملہ میں وہ فقہ کی قائم کردہ حد کے اندر نہیں رہے۔ بلکہ عقل اور قانون اور شریعت ہر چیز سے آزاد ہوکر اپنے زبان اور قلم کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔

مثال کے طور پر مسلمانوں کے ایک نمائندہ عالم کا مضمون انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (یکم مارچ ۱۹۸۹) میں چھپا۔ پھر یہی مضمون اردو اخبارات میں نمایاں طور شائع ہوا۔ اس مضمون میں عبد القادر عودہ کی کتاب التشریع الجنائی الاسلامی (دار الکاتب العربی، بیروت) کے حوالہ سے حسب ذیل باتیں کہی گئی تھیں:

ہم مسلمان بین اقوامیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ہمارا قانون، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ہر مسلمان پر لاگو ہوتا ہے، چاہے وہ جہاں بھی اقامت پذیر ہو۔ یہ جمہور فقہاء (شافعی، مالکی، حنبلی) کا مسلک ہے۔ البتہ حنفیوں کا خیال ہے کہ دیار اسلام سے باہر رہنے والے مسلمان پر اسلامی سزاؤں کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ اسلامی حکومت وہاں احکام نافذ کرنے کے قابل نہیں ہے (جلد ۱، صفحہ ۲۷۸)

اس حوالہ کے ذریعہ مضمون نگار نے یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک اسلامی سزا کے نفاذ کے لیے "قومی سرحدوں" کی کوئی اہمیت نہیں۔ سلمان رشدی اگر مسلم ملک سے باہر (برطانیہ کا باشندہ) ہے، تب بھی اس کو وہاں جاکر قتل کیا جائے گا اور ایسا کرنا عین اسلامی ہوگا۔

مگر یہ ایک لغو بات ہے جس کا کوئی بھی فقیہہ قائل نہیں۔ مذکورہ حوالہ جس کو اپنی تائید کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اس کا "بین اقوامی نفاذ سزا" کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس حوالہ کا تعلق دار الاسلام اور دار الحرب کی فقہی بحث سے ہے۔ اس میں اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ مسلمان کی جان و مال کی عصمت کا تعلق دار سے ہے یا اسلام سے۔ کتاب کے متعلقہ حصہ کا ترجمہ یہ ہے:

اور مسلمان جو کہ دار الحرب میں رہتا ہے اور اس نے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی ہے تو مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک وہ دار الاسلام کے دوسرے مسلمانوں کی طرح ہے۔ اپنے اسلام کے ذریعہ وہ اپنے خون اور مال کو محفوظ کر لے گا، خواہ وہ دار الحرب میں مقیم ہو اور کتنی ہی لمبی مدت تک مقیم رہے۔ وہ جب دار الاسلام میں داخل ہونا چاہے تو اس سے روکا نہیں جائے گا۔ جب کہ ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے

کہ جو مسلمان دار الحرب میں مقیم ہو اور اس نے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہ کی ہو وہ اسلام کے باوجود غیر معصوم ہے۔ کیونکہ ابو حنیفہ کے نزدیک عصمت کا تعلق صرف اسلام سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق دار سے ہے۔ (الجزء الاول، صفحہ ۲۷۸)

اس محولہ عبارت کا سب وشتم کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق تمام تر دار الاسلام اور دار الحرب کے ایک خاص مسئلہ سے ہے جس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔

دو ملک جب ایک دوسرے سے برسرِ جنگ (At war) ہوں تو دونوں کے لیے ایک دوسرے کا جان و مال مباح ہو جاتا ہے۔ عبد القادر عودہ نے اپنی مذکورہ کتاب میں لکھا ہے کہ حربی کا خون اس وقت جائز سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ دار الاسلام میں اجازت کے بغیر داخل ہو جائے۔ اسی طرح مسلم اور ذمی دونوں کا خون حربیوں کے لیے جائز ہو جائے گا جب کہ وہ دار الحرب میں اجازت اور امان کے بغیر داخل ہو جائیں۔ اگر وہ اجازت یا امان کے ذریعہ داخل ہوں تو دونوں مستامن قرار پائیں گے۔ (التشریع الجنائی الاسلامی، الجزء الاول، صفحہ ۲۷۸)

یہاں ایک سوال یہ ہے کہ وہ ملک جو دار الحرب ہو، یعنی جس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حالت جنگ قائم ہو۔ وہاں اگر مسلم اور غیر مسلم دونوں بستے ہیں تو کیا یہ دونوں مباح الدم قرار پائیں گے، یا ان میں سے کوئی ایک مباح الدم ہوگا۔ اس معاملہ میں فقہاء کی دو رائے ہے۔ ایک کے نزدیک دونوں ہی مباح الدم ہوں گے۔ کیونکہ عصمت (حفاظت جان و مال) کا تعلق "دار" سے ہے۔ جس ملک سے حالت جنگ قائم ہے، اس کا ہر باشندہ، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، جنگی قانون کے ماتحت سمجھا جائے گا، الّا یہ کہ وہ ہجرت کر کے دار الاسلام میں آجائے۔

فقہاء کا دوسرا گروہ دار الحرب کی مسلم آبادی اور غیر مسلم آبادی میں فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غیر مسلم مباح الدم ہیں، مگر مسلمان مباح الدم نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک عصمت (حفاظت جان و مال) کا تعلق عقیدہ سے ہے۔ جو شخص مومن و مسلم ہے، وہ اپنے اس عقیدہ کی بنا پر معصوم (محفوظ) ہے، خواہ وہ دار الاسلام میں مقیم ہو یا دار الحرب میں اقامت رکھتا ہو۔

یہ ہے وہ اصل مسئلہ جو مذکورہ کتاب (صفحہ ۲۷۸) میں بیان کیا گیا ہے۔ مگر اس مسئلہ کو غیر واقعی طور پر شتم رسول کے مسئلہ سے جوڑ کر یہ دعویٰ کر دیا گیا کہ شاتم کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا، خواہ وہ سرحد

کے اِس پار ہو یا سرحد کے اُس پار۔

۲۔ دوسری بات مذکورہ کتاب کے حوالہ سے یہ کہی گئی ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے سلمان رشدی اسلامی قانون کی گرفت میں آتا ہے، جو کہ ارتداد کی سزا موت قرار دیتا ہے۔ مزید برآں اگر اسلامی حکومت یہ سزا نافذ نہ کر سکے تو کوئی بھی مسلمان اس کو مجرم کے اوپر نافذ کر سکتا ہے (جلد ۱، صفحہ ۵۳۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ہندستان یا پاکستان سے چل کر انگلینڈ جائے اور وہاں اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت گولی مار کر سلمان رشدی کو ہلاک کر دے تو اس کا یہ فعل عین شریعت (فقہ) کے مطابق ہوگا۔ مگر اس نظریہ کی تائید میں جو حوالہ نقل کیا گیا ہے، اس سے ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔

عبد القادر عودہ کی کتاب کا مذکورہ اقتباس سب وشتم کے بارہ میں نہیں ہے بلکہ ارتداد کے بارہ میں ہے۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ: اصل یہ ہے کہ مرتد کا قتل اقتدار اور حکومت کا معاملہ ہے۔ اب اگر کوئی فرد حکومت کی اجازت کے بغیر مرتد کو قتل کر دے تو اس پر اس کی گرفت کی جائے گی، بذات خود عمل قتل کی بنا پر نہیں۔ یہی رائے مذاہب اربعہ کے فقہاء کی ہے۔ البتہ مالکی مذہب ایک مختلف رائے رکھتا ہے۔ اس کے علماء کا خیال ہے کہ مرتد غیر معصوم ہے۔ مگر ان کی بھی اسی کے ساتھ یہ رائے ہے کہ قاتل کی تعزیر کی جائے گی اور اس کی دیت بیت المال سے ادا کی جائے گی (الجزء الاول، صفحہ ۵۳۵)

عبد القادر عودہ کی مذکورہ عبارت مرتد کے بارہ میں ہے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ وہ اصولاً اس کو درست نہیں قرار دیتے کہ کوئی شخص ذاتی طور پر کسی مرتد کے اوپر اسلامی سزا کا نفاذ کرے۔ البتہ اگر اتفاقاً کوئی شخص ایسا کر گزرے تو اس کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ وہ قانوناً قاتل عمد نہیں قرار دیا جائے گا۔ البتہ اس کی اس غلطی پر اس کے اوپر تعزیری سزا نافذ کی جائے گی اور مقتول کے ورثار کو دیت بھی سرکاری بیت المال سے دی جائے گی۔

اس مسئلہ کو ناقص اور غلط شکل میں پیش کر کے کہہ دیا گیا کہ کوئی شخص اگر انگلینڈ جا کر بطور خود سلمان رشدی کو قتل کر دے تو یہ عین شرعی اور اسلامی فعل ہوگا۔ یہ بلاشبہ سرکشی ہے نہ کہ اسلام۔

یہ صحیح ہے کہ فقہار اسلام کی اکثریت اس رائے پر ہے کہ شاتم رسول کی سزا قتل ہے۔ مگر یہ کوئی استثنائی سزا نہیں ہے جس کی کوئی شرط نہ ہو۔ دوسری اسلامی سزاؤں کی طرح اس کے نفاذ کی بھی کچھ لازمی شرائط ہیں۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر اس کا نفاذ ہرگز درست نہیں۔

عام اصول شریعت کے مطابق، سب سے پہلے یہ ثابت کیا جائے گا کہ واقعۃً شتم کا فعل سرزد ہوا ہے۔ اس ثبوت کی فراہمی کے بعد ایک بااختیار حکومتی ادارہ اس سزا کو مجرم کے اوپر نافذ کرے گا۔ مزید یہ کہ یہ نفاذ صرف اسلامی حکومت کے حدود میں کیا جائے گا، اسلامی حکومت کے حدود سے باہر ہرگز نہیں۔ اس معاملہ میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے پُرجوش مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ تمام حدود و شروط سے آزاد ہو کر جس طرح چاہیں سزا کا نفاذ کریں۔ اور اگر عملی نفاذ نہ کر سکیں تو کم از کم بے قید الفاظ بول کر اس کی دھوم مچائیں۔ مگر یہ شریعت اسلامی کی تعمیل نہیں، یہ یقینی طور پر فکری سرکشی ہے۔ اور یہی فکری سرکشی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں کو متعلقہ فقہی مسئلہ میں وہ دھاندلی کرنی پڑی جس کی ایک مثال اوپر کے حوالہ میں نظر آتی ہے۔

راقم الحروف کو مذکورہ فقہی مسئلہ سے اتفاق نہیں، اس کی بحث "قیاسی مسئلہ" کے تحت اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

حکمت اعراض

قرآن میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی (بری) خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی بابت تحقیق کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ پر نادانی سے جا پڑو۔ پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے (الحجرات ۶)

آدمی کو جب کوئی ناموافق خبر ملتی ہے تو وہ فوراً بپھر اٹھتا ہے اور فریقِ ثانی کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے دوڑ پڑتا ہے۔ مگر ایسے موقع پر اس قسم کا ہنگامی ردِّ عمل سراسر غیر اسلامی ہے۔ صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ خبر پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے اور اس کے بارے میں جو کارروائی کی جائے سمجھ بوجھ کر کی جائے نہ کہ جذباتی ہیجان کے تحت۔ معاملہ جتنا زیادہ سنگین ہو اتنا ہی زیادہ وہ غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے:

التثبت من اللہ والعجلۃ من الشیطان — جلدی نہ کرنا اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جلدی کرنا شیطان کی طرف سے۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۲۱۰)

راقم الحروف کا عمل خدا کے فضل سے اسی شرعی حکم پر ہے۔ چنانچہ جب میں نے سلمان رشدی کی کتاب کی بابت خبریں پڑھیں تو سب سے پہلے میں نے سلمان رشدی کی اصل انگریزی کتاب سیٹنک ورسز (The Satanic Verses) حاصل کی۔ اور ۵۴۷ صفحات کی اس کتاب کو پڑھا۔ اسی کے ساتھ میں نے اس معاملہ میں شرعی حکم کی دوبارہ تحقیق کی۔ اس سلسلہ میں دوسری فقہی کتابوں کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ کی عربی کتاب 'الصارم المسلول علی شاتم الرسول' کو حاصل کر کے پڑھا جو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اور اس موضوع پر اسلامی کتب خانہ کی واحد جامع اور مفصل کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس دو طرفہ تحقیق کے بعد میں نے اس موضوع پر لکھنے کا کام شروع کیا۔

مگر مسلم رہنماؤں نے جس طرح عاجلانہ اور ناقص انداز میں اپنے بیانات دیے، اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے غالباً اصل کتاب کو پڑھے بغیر محض سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے اس کے خلاف لفظی ہنگاموں کا جوش دکھانا شروع کر دیا۔ مجھے یہ بھی نظر نہیں آتا کہ ان میں سے کسی نے اس احساس ذمہ داری کا ثبوت دیا ہو کہ وہ اس معاملہ میں شرعی حکم کی از سرِ نو پوری تحقیق کرے، یا علامہ ابن تیمیہ

کی مذکورہ کتاب کو مکمل طور پر پڑھے، اور اس کے بعد اس مسئلہ پر اپنی زبان کھولے۔

اس عجلت پسندی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایران کے آیت اللہ خمینی نے جب سلمان رشدی کے قتل کا فرمان جاری کیا تو اس کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بیان اخبار قومی آواز (۲۰ فروری ۱۹۸۹) میں چھپا۔ اس میں انھوں نے آیت اللہ خمینی کے فرمان کی تائید کرتے ہوئے اس کو حق بجانب قرار دیا۔ مگر کچھ دنوں بعد مولانا موصوف نے تعمیر حیات (۱۰ مارچ ۱۹۸۹) میں دوسرا بیان شائع کیا۔ اس دوسرے بیان میں سابق بیان کی تعدیل کرتے ہوئے صرف یہ خبر دی گئی تھی کہ آیت اللہ خمینی کے فرمان سے مسلمانوں کو خوشی ہوئی۔ پہلے بیان میں آیت اللہ خمینی کے فتوے کی ذاتی تصدیق تھی، دوسرے بیان میں صرف مسلمانوں کے ردعمل کی ایک اطلاع۔

اسی طرح مولانا ابواللیث اصلاحی کا ایک بیان نئی دنیا (۳-۹ مارچ ۱۹۸۹) میں چھپا۔ اس میں انھوں نے شیطانی آیات کے مصنف سلمان رشدی کے بارہ میں آیت اللہ خمینی کے قتل کے فرمان کو قابلِ تحسین قرار دیا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے اخبار دعوت (۲۸ مارچ ۱۹۸۹) میں دوسرا مفصل بیان شائع کیا تو اس میں ان کا انداز واضح طور پر بدلا ہوا تھا۔ پہلا بیان اگر آیت اللہ خمینی کی لائنوں پر تھا تو دوسرا بیان اس لائن پر جو ریاض میں ۶ مسلم ملکوں کی کانفرنس میں متفقہ طور پر اختیار کی گئی۔

بظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے، میرا احساس یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنما مذکورہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب لکھ کر خود اپنے آپ کو ننگا کیا تھا۔ مگر اس کتاب کی اشاعت نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ موجودہ مسلمان دوسروں کو "جہنم رسید" کرنے کے لیے اتنے زیادہ بیتاب ہیں کہ انھوں نے یہ بات بھی بھلا دی ہے کہ انہیں سب سے پہلے اپنے آپ کو "جنت رسید" کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص نہیں جس کی جنت لازمی طور پر خدا کے یہاں ریزرو ہو چکی ہو۔

مذکورہ قرآنی حکم (الحجرات ۶) کے مطابق، مسلم رہنماؤں پر لازم تھا کہ وہ پہلے اس معاملہ کی تحقیق کرتے اور پھر اس کے تمام پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر اس کے بارے میں مناسب کارروائی کا فیصلہ

کرتے۔ مگر انھوں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے عجلت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور فوری ردعمل کے تحت اس کے خلاف تیز و تند بیانات دیتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کارروائیوں کا سارا فائدہ سلمان رشدی کے خانہ میں چلا گیا، اور اس کا سارا نقصان صرف اسلام کے حصہ میں آیا۔

مسلم رہنما اگر اس معاملہ کی تحقیق کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ سلمان رشدی کی کتاب اگرچہ نہایت بے ہودہ ہے، مگر اسی کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ ناقابلِ مطالعہ بھی ہے۔ وہ کوئی تخلیقی ناول (Creative novel) نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے وہ اتنی پست اور اتنی غیر دلچسپ ہے کہ وہ سرے سے اس لائق ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کو شروع سے آخر تک پڑھے۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہا ہے کہ ناول کی حیثیت سے بھی وہ پڑھنے کے قابل نہیں:

Even as a novel, *the Satanic Verses* is not readable.

ایک اور انگلش جرنلسٹ مسٹر ارن شرما نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ـــــ تیسرے درجہ کا موضوع، دوسرے درجہ کا مصنف، اور اوّل درجہ کا کاغذ:

Third rate theme, by a second rate author, on a first rate paper.

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی موت آپ مر جاتی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں۔ یہ صرف مسلمانوں کا احمقانہ شور و غل ہے جس نے اس کو غیر ضروری طور پر زندہ کر دیا۔ اور نہ پڑھنے والے لوگ بھی اس کو خریدنے کی طرف مائل ہو گئے۔ اگرچہ ان خریدنے والے لوگوں کے ذوق کا یہ بہت برا اندازہ ہوگا اگر ہم یقین کریں کہ وہ لوگ پوری کتاب کو پڑھنے کی مشقت بھی ضرور برداشت کریں گے۔

ٹائم میگزین کے ایک قاری (Margareta du Rietz) نے اس معاملہ پر بہترین تبصرہ کیا جو ٹائم (۲۰ مارچ ۱۹۸۹) میں چھپا ہے۔ اس نے کہا کہ بہت ہی کم لوگوں نے اس ناول پر دھیان دیا تھا، خمینی کا شکریہ کہ آج وہ عالمی شہرت کی کتاب بنی ہوئی ہے:

Very few took note of this novel. Now, thanks to Khomeini, it is world famous.

نیویارک ٹائمس کی رپورٹ کے مطابق سلمان رشدی کی یہ کتاب امریکہ میں اس وقت سب سے زیادہ بکنے والی کتاب (Best seller) بنی ہوئی ہے۔ کتاب کے پبلشر نے اپنے ایک

بیان میں کہا کہ ہم امام خمینی کا شکریہ ادا کرتے ہیں، کیونکہ وہ ہمارے سب سے بڑے سیل مین (Salesman) ثابت ہوئے ہیں۔

سلمان رشدی کے سلسلہ میں بے شمار چیزیں اخبارات و رسائل میں چھپ چکی ہیں، ایک خط جو ڈبلیو ایم شیخ کے قلم سے تھا، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے، یہ خط ٹائمس آف انڈیا (۹ نومبر ۱۹۸۸) میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا: رشدی کو نظر انداز کرو (Ignore Rushdie)

مسلم رہنما اگر اس معاملہ میں قرآنی حکم پر عمل کرتے، اور اقدام سے پہلے اس کے بارہ میں غور و فکر کرتے تو یقیناً انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس کتاب کے بارہ میں صحیح ترین ردّ عمل وہ ہے جس کی رہ نمائی خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے ایک قول میں ملتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ باطل کو ہلاک کرو، اس کے بارہ میں چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنہ)

I have read the comments on Salman Rushdie's controversial novel *The Satanic Verses* including his letter to our Prime Minister, and I think the move to ban the book is both unfortunate and uncalled for. Some years back Mr Rushdie wrote a novel called *Midnight's Children*. That earned him some fame but not much money. Immediately after this novel Mr Rushdie came on a lecture tour of India. He delivered a series of lectures in Bombay. I attended two of these, one at the University Hall and the other at the President hotel. I met Mr Rushdie on both these occasions and found him to be a delightful intellectual.

But over the years Mr Rushdie has grown into a very shrewd businessman. He cleverly centres his novels around some controversy. Immediately after his *Midnight's Children,* he wrote his novel *Shame* about Pakistan. The book was immediately banned in Pakistan. This is what Mr Rushdie wanted. I am sure every adult and literate person in Pakistan must have paid double or treble the price to buy and read Shame.

He has played the same trick this time in writing *The Satanic Verses.* I am certain that every bookseller in India must be secretly selling or will sell this book to the Indian public at fabulous prices and thereby ensure Mr Rushdie his millions. I would therefore request my Muslim brethren in India and Pakistan not to be duped by Mr Rushdie's trickery and strategem.

His comments on the Prophet of Islam in any case appear to be lukewarm compared to what has already been written by men like Edward Gibbon. In fact, comments on the life of the Prophet of Islam by Christian authors, which appeared in the aftermath of the Crusades are overladen with lies and palpable calumnies. In comparison, what Mr Rushdie has written must be chicken feed. Let us not, therefore, fall a prey to his trickery and deception. At best he is in the class of mediocre writers and at worst he can be regarded as an undistinguished penman. I feel sure that his book will die a natural death, if ignored.

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مذکورہ قول بہت بامعنی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز بظاہر یقینی طور پر "باطل" ہو، تب بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے خلاف جنگ وقتال چھیڑ دیا جائے، اور اس کو ہلاک کرنے کے نام پر ہنگامہ کیا جانے لگے۔ باطل کو باطل جانتے ہوئے بھی بعض اوقات ضروری ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی جائے۔

باطل کو باطل ثابت کرنا اس کے حق میں زیادہ بڑا قتل ہے۔ باطل کو نظر انداز کرنے کا خاص فائدہ یہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کبھی ہلاک نہ کرنے ہی کا نام ہلاک کرنا ہوتا ہے۔ کبھی نظر انداز کرنا زیادہ بڑی سزا دینے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ مگر نادان لوگ اس راز کو نہیں جانتے۔ شور کی زبان کو سمجھنے والے چپ کی زبان کو نہیں سمجھتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ اس وقت آپ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جو شخص تم کو توہین کرتا ہوا نظر آئے، اس کو فوراً قتل کر دو۔ قرآن میں کثرت سے ایذا رسانی کا ذکر ہے، مگر اس قسم کا حکم کہیں بھی نہیں دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں کہا گیا ہے کہ ان کی ایذا رسانی کو نظر انداز کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو (وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ، الاحزاب ۴۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہانت اور ایذا رسانی کا جواب صرف یہی نہیں ہے کہ مجرم کو سزا دی جائے۔ اس کا ایک کامیاب جواب یہ بھی ہے کہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا جائے۔ اس کے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اس کو قانون قدرت کے حوالہ کر دیا جائے۔

یہ اسلام کی ایک عظیم الشان حکمت ہے، یہی وہ خاص حکمت ہے جس کو حضرت امیر معاویہؓ نے (باعتبار مفہوم) اس طرح بیان کیا کہ ——— جہاں میری خاموشی کافی ہو وہاں میں کلام نہیں کرتا۔ جہاں میری زبانی تنبیہ کافی ہو، وہاں میں اپنی تلوار نہیں اٹھاتا۔

پرنٹ میڈیا، الکٹرانک میڈیا

مسلم رہنماؤں کو یہ جاننا چاہیے تھا کہ اس معاملہ میں ان کا اقدام کوئی سادہ اقدام نہیں ہے۔ یہ پوری مغربی دنیا کے "مذہب" پر براہ راست حملہ ہے۔ مسٹر ایڈورڈ مارٹیمر (Edward Mortimer)

نے بجا طور پر کہا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا مذہب اسلام ہے، اسی طرح ہمارا مذہب آزادی (Freedom) ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کی توہین یا اس پر حملہ سے جس طرح بپھر اٹھتے ہیں، ہم کو بھی اسی طرح سخت تکلیف پہنچتی ہے جب کہ ہمارے مذہب (آزادی) پر حملہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے نزدیک اگر رسول کی بے حرمتی کلمۂ کفر (Blasphemy) ہے تو ہمارے نزدیک آزادی کی بے حرمتی اتنی ہی شدت سے کلمۂ کفر کی حیثیت رکھتی ہے (ٹائمس آف انڈیا، ۲۸ فروری ۱۹۸۹)

یہی وجہ ہے کہ جس طرح مسلم دنیا سلمان رشدی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے، اسی طرح مغربی دنیا سلمان رشدی کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنا کر اس کی حمایت پر کمربستہ ہے۔ مغربی دنیا کی طرف سے سلمان رشدی کی حمایت کا سبب "اسلام دشمنی" نہیں ہے، جیسا کہ مسلم رہنما سطحی طور پر اس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔ بلکہ یہ اپنے "مذہب" کا دفاع ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح مسلمان اپنے مذہب کے دفاع کے لیے متحرک ہیں۔

اس طرح یہ لڑائی، مسلمان بمقابلہ رشدی نہیں رہی، بلکہ مسلمان بمقابلۂ مغرب بن گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں پوری مغربی دنیا از سر نو اسلام کے خلاف نفرت اور حقارت سے بھر گئی ہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد پورے یورپ میں اسلام کے خلاف شدید نفرت کا طوفان آیا تھا جو صدیوں تک پوری طاقت سے جاری رہا۔ تاہم موجودہ زمانہ کے سائنسی انقلاب نے اس مذہبی نفرت کو بڑی حد تک ختم کر دیا تھا۔ اور دوبارہ وہ معتدل ماحول پیدا ہو گیا تھا جس میں اہل یورپ کو اسلام کی دعوت دی جائے اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

یہ حالات اس درجہ موافق تھے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد، یورپ اور امریکہ میں اسلامی دعوت کا کام اپنے آپ ہونے لگا۔ اس عمل کو ۱۹۷۹ میں پہلا جھٹکا لگا جب کہ ایران میں نام نہاد اسلامی انقلاب آیا۔ اس کے بعد انقلابیوں کے ہاتھوں پیش آنے والے وحشیانہ واقعات نے ساری دنیا میں لوگوں کو اسلام سے بیزار کر دیا۔ ایران کا انقلاب صرف اینٹی شاہ انقلاب تھا نہ کہ کوئی اسلامی انقلاب۔ اس کے رہنما اگر اس کو اینٹی شاہ انقلاب بتاتے تو اسلام بدنامی سے بچ جاتا۔ مگر خلاف واقعہ طور پر اس کو اسلامی انقلاب کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام بدنام ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد ۱۹۸۹ میں مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف (عملاً پورے مغرب کے خلاف)

جونا قابل فہم حد تک غیر عاقلانہ تحریک چلائی، اس نے سارے مغرب میں اسلام کے خلاف سوئی ہوئی نفرتوں کو دوبارہ نئے عنوان سے جگا دیا۔ مسلمان سلمان رشدی کو قتل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ البتہ انھوں نے اپنی بے معنی سرکشی کے ذریعہ اسلام کے دعوتی امکانات کو یقیناً قتل کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت اسلام کے حق میں جو دعوتی فضا بنی، اس کو بنانے میں مسلم رہنماؤں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ یہ تمام تر اللہ تعالیٰ کا معاملہ تھا جو براہ راست قانونِ قدرت کے تحت پیش آیا۔ مسلم رہنماؤں کی یہ غلطی (صحیح تر لفظ میں سرکشی) بلاشبہ آخری حد تک ناقابل معافی ہے۔ یہ جرم یقیناً سلمان رشدی کے جرم سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ سلمان رشدی کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش میں مسلم رہنماؤں نے خود اپنے آپ کو شدید تر قسم کے مجرمانہ کٹہرے میں کھڑا کر لیا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۹ مارچ ۱۹۸۹، سکشن ۲) کے صفحہ اوّل پر پہلی خبر کی سرخی یہ ہے ـــــ رشدی کی کتاب اسلام اور مغرب کے ٹکراؤ کو دوبارہ جگاتی ہے :

'Verses' rekindle Islam-West conflict

رائٹر کی اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اسلام اور مغرب کے درمیان ۱۳ صدیوں سے جو سیاسی اور فوجی رقابت قائم تھی، جس نے دونوں کے درمیان تعصب اور غلط فہمی کی تلخیاں پیدا کر رکھی تھیں، وہ سلمان رشدی کے ناول "شیطانی آیات" کے ذریعہ از سر نو زندہ ہو گئی ہیں۔ ۱۹۷۹ میں ایران کے نام نہاد انقلاب کے ذریعہ اسلام اور مغرب کے درمیان تعصب کی جو فضا پیدا ہوئی تھی اس کے بعد یہ دوسرا شدید ترین واقعہ ہے جو رشدی کی کتاب کے ذریعہ سامنے آیا ہے۔

اسلام اور مغرب کے درمیان یہ کشمکش اسپین اور فرانس میں مسلمانوں کے حملہ سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد قرون وسطی میں صلیبی جنگوں اور اس کے بعد ۱۹ ویں صدی میں مسلم دنیا پر یورپ کی فتح کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھتے رہے (صفحہ ۱) اس طرح کی مختلف تفصیلات دیتے ہوئے رپورٹر نے بتایا ہے کہ کس طرح اسلام اور مغرب کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات چھپے ہوئے ہیں۔

یہ رپورٹ بطور واقعہ صحیح ہے۔ اس نفرت نے ایک ہزار سال سے مغرب کے درمیان اسلام کی وسیع اشاعت کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ جدید سائنسی انقلاب نے مذہب کو غیر موثر بنا کر اس میں بہت زیادہ کمی کی ہے تاہم سطح کے نیچے اب بھی یہ منفی جذبات اہلِ مغرب کے درمیان موجود ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ قرآن وسنّت کی رہنمائی میں ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ یک طرفہ "صبر" کے ذریعہ ہم حالات کو خوشگوار بنائیں تاکہ وہ معتدل فضا قائم ہو جس میں موثر طور پر اہلِ مغرب کے درمیان اسلام کی دعوت واشاعت کا کام کیا جا سکے۔

دعوت کے حق میں موافق فضا بنانے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل ہر قسم کی توہین اور اذیت کو برداشت کیا۔ حتی کہ دعوتی امکان کو کھولنے کے لیے، معاہدہ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے لفظ "رسول اللہ" کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیا، حالانکہ یہی آپ کی اصل حیثیت تھی اور اسی کے اعلان کے لیے آپ دنیا میں تشریف لائے۔

اس سنّت رسول کے مطابق مسلمانوں کو یہ کرنا تھا کہ وہ سلمان رشدی کی کتاب کے بارے میں مکمل طور پر نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرتے۔ اس طرح، حضرت عمر فاروقؓ کے قول کے مطابق، رشدی کی کتاب خود اپنی موت مر جاتی۔ دوسری طرف اس طرز عمل کا یہ فائدہ ہوتا کہ مختلف اسباب کے تحت مغرب میں اسلامی دعوت کے جو امکانات کھل رہے ہیں، ان کا عمل بدستور جاری رہتا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا کہ مغربی دنیا غیر متعصبانہ ذہن کے تحت اسلام کا مطالعہ کرنے لگے، اور بالآخر وہ خدا کی رحمتوں کے سائے میں آجائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف اسباب کے تحت موجودہ مغربی دنیا میں اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھلے ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ مسلم رہنماؤں نے نہ ان جدید امکانات کو دیکھا اور نہ وہ ان کو استعمال کر سکے۔ کچھ لوگ رنگ کے اندھے (Colour-blind) ہوتے ہیں انہیں ایک رنگ دکھائی دیتا ہے اور دوسرا رنگ بالکل نظر نہیں آتا۔ اسی طرح موجودہ مسلم رہنما دعوت کے اندھے (Dawah blind) ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں ہر دوسری چیز دکھائی دیتی ہے، مگر دعوت کا معاملہ انھیں نظر نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم رہنما دعوت کے امکانات سے بالکل بے خبر ہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص ایسی

حرکت کردے جس سے ان کے قومی وقار کو ٹھیس پہنچے تو اس کو وہ مبالغہ آمیز شدت کے ساتھ فوراً محسوس کر لیتے ہیں۔ دعوتی امکانات کے بارے میں اپنے اندھے پن کی وجہ سے وہ ایک بار بھی دعوت کے لیے سرگرم نہ ہو سکے۔ دوسری طرف وہ اپنی قومی توہین کے معاملہ میں اپنی بے جا سرگرمیوں کے ذریعہ پوری دنیا کو گرد آلود بنا رہے ہیں۔

اگر خدا کا دین وہی ہے جو قرآن و حدیث میں بتایا گیا ہے، تو یقینی طور پر مسلم رہنماؤں کی یہ سرگرمیاں صرف مجرمانہ سرگرمیاں ہیں، وہ کسی بھی درجہ میں خدا و رسول کا مطلوب کام نہیں۔ ان جھوٹی سرگرمیوں کے نتیجہ میں موجودہ مسلم رہنماؤں کو جو شہرت اور قیادت مل رہی ہے، اس نے انہیں اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ نصیحت کی کوئی بات سن سکیں۔ مگر عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب کہ فرشتے کی چنگھاڑ کے ذریعہ یہ حقیقت زمین و آسمان کے اندر گونجے گی۔ اس وقت وہ اس کو مان لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا ماننا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔

دورِ آزادی

ٹائمس آف انڈیا (۲۸ فروری ۱۹۸۹، سکشن ۲) کے صفحہ ۳ پر ایک برطانی صحافی ایڈورڈ مارٹیمر (Edward Mortimer) کا مضمون چھپا ہے جس کا عنوان یہ ہے: رشدی کا معاملہ آزاد دنیا کے لیے براہ راست خطرہ۔ مضمون نگار نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

ہم اپنے آپ کو ایک مذہبی جنگ میں گھرا ہوا پاتے ہیں، نظریات کی جنگ ـــــ برطانی لوگوں کے ردعمل سے ہمارے اندر بھی ہتک کا اتنا ہی احساس پیدا ہوتا ہے جتنا مسلمانوں کو "شیطانی آیات" نامی کتاب سے۔ کیونکہ اس کتاب کے خلاف ردعمل یکساں طور پر ہمارے مذہب پر حملہ ہے۔ "ہمارے مذہب" سے میری مراد عیسائیت نہیں ہے۔ عیسائیت اس معنی میں اب برطانیہ کا مذہب نہیں جس معنی میں اسلام

THE RUSHDIE AFFAIR
DIRECTLY THREATENS THE 'FREE WORLD'

We find ourselves caught up in a religious war, a war of ideas... Their (British people) reaction arouses no less passionate feelings of outrage in us, because it is equally offensive to our religion. By "our religion" I do not mean Christianity. The Christian establishment is, in fact, very awkwardly placed in this affair: it disapproves strongly of incitement to murder but clearly feels some sympathy with the Muslim demand for censorship of "blasphemy". But Christianity is no longer the religion of Britain in the sense that Islam is the religion of Iran. It is not Christianity that binds us together as a community, because we have long since given up trying to impose religious uniformity on ourselves or to exclude unbelievers and members of other faiths from full participation in our national life. The religion of this country, and of the "free world" to which it belongs, is, precisely, freedom. Its founding fathers are Locke, Voltaire, Burke, Wilkes, Tom Paine, the authors of the American Constitution and of the Declaration des Droits de l'homme. Unlike Iranians, we are brought up to think it primitive to fight over metaphysical beliefs, but to think of fighting for freedom as something admirable. Of course, like other peoples, we practise this religion imperfectly, and not everyone takes it as seriously as do journalists, the self-appointed priests or mullahs of the cult. But the idea of sentencing a writer to death for what he wrote is just as offensive to modern Western sensibilities as the idea that Christ might have liked to make love to Mary Magdalene, or that the Prophet might occasionally have listened to Satan, is to traditional Christian or Muslim ones. (By arrangement with the *Financial Times)*

ایران کا مذہب ہے۔ یہ مسیحیت نہیں ہے جو کہ ہم کو ایک قوم کی حیثیت سے مجتمع کرتی ہو، کیونکہ عرصہ ہوا ہم اس کو اس اعتبار سے چھوڑ چکے ہیں۔ اس وقت برطانیہ کا مذہب، صحیح لفظ میں، آزادی ہے۔ اس مذہب کے بانی لاک، والٹیر، برک، ولکیز اور ٹام پین ہیں۔ امریکی دستور کے مصنفین اور حقوق انسانی کے منشور نے اس کی تشکیل کی ہے۔ ہماری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے کہ ہم آزادی کی لڑائی کو ایک قابل تعریف کام سمجھیں۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح، ہم اس مذہب آزادی پر غیر معیاری انداز میں عمل کرتے ہیں۔ اگرچہ صحافی جو گویا اس مذہب کے پادری اور ملّا ہیں، ان کے سوا کوئی اس انحراف کو بہت سنجیدہ معنوں میں نہیں لیتا۔ مگر یہ تصور کہ ایک ادیب کو اس کی لکھی ہوئی چیز کی بنا پر قتل کر دیا جائے، یہ جدید مغربی حسّاسیت کے لیے ویسا ہی تصور ہے جیسا کہ مسیحیوں کے لیے یہ تصور کہ مسیح، مریم کے ساتھ جنسی تعلق قائم کریں یا مسلمانوں کے لیے یہ تصور کہ پیغمبر کے الہام میں کبھی کبھی شیطان کا القا بھی شامل رہتا تھا۔

ایڈورڈ مارٹیمر کی بات جو اوپر نقل کی گئی، وہ باعتبار واقعہ صد فی صد درست ہے۔ سلمان رشدی کے معاملہ میں نادان مسلمانوں نے جو ہنگامے کیے، اس کے خلاف مغرب کے شدید ردعمل کی وجہ یقیناً یہی ہے۔ جو لوگ اس معاملہ میں مغرب کے رویہ کو اسلام دشمنی یا اسلام کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں۔ وہ صرف اپنی جاہلانہ بے بصیرتی کی خبر دے رہے ہیں نہ کہ کسی حقیقت واقعہ کا اعلان کر رہے ہیں۔ جو لوگ حقیقتوں کو اتنا کم جانیں، ان کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان بند رکھیں، نہ کہ سطحی الفاظ بول کر غیر ضروری طور پر عوام کا ذہن خراب کریں۔

اس طرح کے معاملات کو مغرب کی "اسلام دشمنی" بتا کر لفظی شور کرنے کا فائدہ کچھ نہیں، البتہ اس کا نقصان یقینی ہے۔ اگر بالفرض یہ دشمنی کا معاملہ ہو تو اخباروں اور جلسوں میں الفاظ کی چیخ پکار کرنے سے اس میں ایک فی صد بھی کمی آنے والی نہیں۔ البتہ اس کا یہ یقینی نقصان ہے کہ مسلمانوں کا دل بغض و انتقام سے بھر جائے۔ مدعو قوموں کے بارہ میں ان کے اندر وہ ناصحانہ جذبہ باقی نہ رہے جو داعی کی حیثیت سے ان سے مطلوب ہے۔ دعوت کا تقاضا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان کشیدگی کی فضا نہ ہو۔ مگر اس قسم کے ہنگاموں نے مسلمانوں اور دوسری قوموں کے تعلق کو دعوت کے بجائے عداوت کی بنیاد پر قائم کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چپ رہنا بھی ایک کام ہے، جس طرح بولنا ایک کام ہے۔ بولنے کے موقع پر نہ بولنے

والا اگر گونگا شیطان ہے، تو نہ بولنے کے موقع پر بولنے والا ناطق شیطان۔ اور باعتبار نتیجہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

آزادی کا مذکورہ مطلق تصور بظاہر اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن اگر اس کو گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ عین اسلام کے حق میں نظر آئے گا، کیونکہ آزادی کے اس جدید انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار عالمی سطح پر ایسی صورت حال پیدا کی ہے کہ دعوت کے دروازے بے اندازہ حد تک کھل گئے ہیں۔ آزادی جتنی زیادہ عام ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ مسلمانوں کے لیے دعوت کے زیادہ وسیع مواقع کھولنے کا سبب بنے گی۔ اور دعوت کے مواقع کھلنا، قرآن کے الفاظ میں، فتح مبین کا دروازہ کھلنا ہے۔

قدیم زمانہ میں اظہار خیال کی آزادی کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں دین حق کی آزادانہ تبلیغ ممکن نہیں ہوتی تھی، توحید کا نام لیتے ہی داعیان توحید کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ یہ صرف موجودہ زمانہ کی بات ہے کہ توحید کی طرف لوگوں کو بلانے میں کوئی سیاسی رکاوٹ حائل نہیں رہی۔

یہ جدید انقلاب تمام تر اسی تصور آزادی کی دین ہے جس کا ذکر ایڈورڈ مارٹیمر نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اس آزادی نے تاریخ میں پہلی بار ہر ایک کے لیے اپنے فکر و خیال کے اظہار کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔ آزادئ فکر آج ایسا مسلّمہ حق بن چکا ہے جس سے انکار نہ کیا جا سکے۔

مگر یہ آزادی لازمی طور پر سب کے لیے ہوگی نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے۔ اپنے لیے آزادئ کامل کا حق پانے کے لیے دوسروں کو بھی آزادئ کامل کا حق دینا پڑتا ہے، یہ دنیا دو طرفہ ٹریفک کی جگہ ہے۔ یہاں یک طرفہ ٹریفک کا طریقہ ہرگز ممکن نہیں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ سڑک کے اوپر اپنی گاڑی تیز دوڑائیں تو آپ کو دوسروں کے لیے بھی اس کا موقع دینا ہوگا۔ دوسروں کو موقع دیے بغیر اپنے لیے موقع پانا ہرگز ممکن نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ "ٹریفک" کے لیے کچھ اخلاقی ضابطہ ہونا چاہیے۔ مگر یہ ضابطہ صرف مشترک امور میں قابل عمل ہے، وہ انفرادی اور گروہی امور میں قابل عمل نہیں۔ یعنی وہ اصول جس کا تعلق تمام لوگوں سے ہو، جو ہر ایک کی عمومی ضرورت ہو، اس کی بندش تو قائم کی جا سکتی ہے۔ مگر کسی شخصی یا گروہی دل چسپی کی بات پر عمومی ضابطہ بندی ممکن نہیں۔ اور اگر جوش اصلاح میں کوئی حکمراں ایسی ضابطہ بندی نافذ کرے جو ایک کے موافق اور دوسرے کے خلاف ہو تو وہ عملی طور پر کبھی نافذ نہیں ہو سکے گی۔ وہ صرف ایک کاغذی

کارروائی بن کر رہ جائے گی۔

اس کی ایک مثال خود سلمان رشدی کی کتاب ہے۔ اس نزاعی کتاب پر ہندستان اور پاکستان میں پابندی لگائی گئی۔ مگر دونوں ملکوں میں اس کے غیر قانونی ایڈیشن فروخت ہو رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ کتاب کھلے بازار میں ملتی، اب وہ بلیک مارکٹ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچ رہی ہے۔ قانونی پابندی کے باوجود کتاب پر حقیقی پابندی لگانا ممکن نہ ہو سکا۔

جمہوری ملکوں میں آزادانہ تجارت کا حق ہے۔ اس آزادی نے اگر کپڑے اور جوتے اور غلہ کے تاجروں کو موقع دیا ہے کہ وہ تجارتی ادارے کھول کر بڑے بڑے نفع کمائیں تو اسی کے ساتھ شراب جیسی ناجائز چیزوں کی دکانیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود کروروں مسلمان آزادانہ تجارت کے اس ماحول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ تجارت کے ذریعہ دولت کما کر اپنے خاندان کے لیے اور ملّی اداروں کے لیے نفع پہنچانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ کسی مسلمان نے ایسا نہیں کیا کہ وہ اس آزادی سے صرف اس لیے فائدہ نہ اٹھائے کہ اس کی وجہ سے شراب فروشوں کو بھی آزادانہ تجارت کا موقع حاصل ہو گیا ہے۔

ذاتی انٹرسٹ کے معاملہ میں تمام مسلمان اسی حکمت کو عملاً اختیار کیے ہوئے ہیں، مگر جب ملّت کا سوال سامنے آئے تو وہ فوراً یہ جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ پہلے "شراب کی دکان" بند کرو، اس کے بعد ہم بازار میں "کپڑے کی دکان" کھولیں گے۔ دوسروں پر پابندی قائم کرنے سے پہلے ہم آزادی سے فائدہ اٹھانے والے نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاہدۂ حدیبیہ کے موقع پر فریق مخالف کو اس کا پابند کرنا چاہتے تھے کہ وہ آپ پر یا آپ کے حلیف قبائل پر حملہ نہ کریں۔ اس کی خاطر آپ کو خود اپنے آپ کو بھی اس کا پابند کرنا پڑا کہ آپ فریق مخالف کے اوپر یا اس کے حلیف قبائل کے اوپر حملہ نہیں کریں گے۔ حالانکہ خود خدا کی گواہی کے مطابق، یہ یقینی تھا کہ آپ پوری طرح انصاف پر ہیں اور فریق ثانی پوری طرح ناانصافی پر۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو دوسروں کی طرف سے یہ حق صرف اس وقت ملا جب کہ آپ دوسروں کو بھی اپنی طرف سے یہ حق دینے پر راضی ہو گئے۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ عمومی آزادی کے نتیجہ میں کچھ بے اعتدالیاں پیدا ہوں گی۔ مثلاً کچھ لوگ اسلام

پر بے جا تنقید کریں گے۔ یا ایسی کتابیں چھاپیں گے جو مسلمانوں کو اسلام کی اہانت معلوم ہوں۔ مگر یہاں مسلمانوں کو جس چیز پر اعتماد کرنا چاہیے وہ اسلام کی ناقابل شکست صداقت ہے نہ کہ قانون کی پشتہ بندی۔ کیونکہ جس شخص کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے پستول اور بندوق اور رائفل ہو وہ کبھی غلیل حاصل کرنے کے لیے نہیں دوڑتا۔ جب اسلام ایک کامل صداقت ہے تو ہمیں اس قسم کی باتوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔

اگر مسلمانوں کو اس حقیقت کا صحیح احساس ہو تو وہ مخالفین کے الفاظ کو مزید طاقتور الفاظ سے رد کریں گے۔ وہ ان کی تحقیر و اہانت کو دلائل کے سیلاب سے بہا کر نشور آبنا دیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس اپنے مذہب کے حق میں فخر و ناز کا ذخیرہ تو ضرورت سے زیادہ ہے، مگر دلائل و براہین کا ذخیرہ ضرورت سے بھی کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہانت کا کوئی لفظ دیکھ کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اپنی کمی کو دور کرنا چاہیے، نہ کہ دوسروں کے خلاف مشتعل ہو کر وہ اسلام کی جگ ہنسائی کا سامان کریں۔

رشدی یا اس کے جیسے دوسرے افراد کے خلاف مسلمان جو شور و غل کرتے ہیں، اس کو وہ بطور خود "ناموس رسول کی حفاظت" کا نام دیتے ہیں۔ اگر ان ہنگاموں کا مقصد واقعۃً "ناموس رسول کی حفاظت" ہو تو ان کی یہ سرگرمیاں سراسر بے فائدہ ہیں۔ کیونکہ وہ ناموس رسول کی مفروضہ حفاظت میں سراسر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

سوامی شردھانند ہندستان میں شدھی تحریک کے بانی تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "رنگیلا رسول" تھا۔ برصغیر ہند کے مسلمانوں نے اس کتاب کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ کتاب پیغمبر اسلام کی شان اور عظمت کے خلاف نہایت توہین آمیز تھی۔ آخر کار یہ واقعہ پیش آیا کہ دسمبر ۱۹۲۶ کی آخری تاریخوں میں ایک مسلم نوجوان نے سوامی شردھانند کو قتل کر دیا۔ اس نوجوان کا نام عبدالرشید تھا۔ اس کی بیوہ ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو خوشی خوشی اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ ناموس رسول کی حفاظت کے لیے قربان ہو جائے۔

لیکن اگر ناموس رسول کی حفاظت کا طریقہ یہی ہو تو یقیناً یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ اس قتل کے بعد شردھانند نے اس ملک کی اکثریت کے درمیان قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر لی۔ ملک کی تاریخ

میں ان کو "شہید" کا مقام دیا گیا۔ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا تو راجدھانی دہلی کے ممتاز مقام (چاندنی چوک) پر ان کا بلند و بالا مجسمہ عین شاہراہ پر نصب کر دیا گیا۔ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے کسی عمل کو ناموس رسول کے نام پر بے فائدہ جان دے دینا تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کو ناموس رسول کی حفاظت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ یہ قربانی نہیں ہے بلکہ نادانی ہے، جس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔

مسلمان دوسروں کی جن باتوں پر بھڑکتے ہیں، خود بھی وہ دوسروں کے لیے اسی قسم کے الفاظ بولتے ہیں۔ مگر موجودہ مسلمانوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ دوسرے لوگ اپنے مذہب کے بارہ میں اتنے حساس نہیں ہیں جتنا کہ مسلمان، اپنی شکست خوردگی کی بنا پر حساس ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی مسلمان جب دوسروں کے مذہب بارے میں سخت الفاظ بولتا ہے تو وہ اس کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جب دوسرے فرقوں کا کوئی شخص اسلام کے خلاف سخت الفاظ استعمال کرتا ہے تو مسلمان فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسلمان غیر شعوری طور پر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم دوسروں کے خلاف کچھ نہیں کہتے، البتہ دوسرے لوگ ہمارے خلاف بولتے رہتے ہیں، حالانکہ یہ خوش فہمی واقعہ کے مطابق نہیں۔

ایک مثال لیجئے۔ جنوبی افریقہ کے احمد دیدات صاحب دوسرے مذاہب کے خلاف مناظرہ کرتے ہیں اور لٹریچر چھاپتے ہیں۔ وہ جس قسم کی زبان بولتے ہیں، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ان کے انگریزی بلیٹن البرہان (دسمبر ۱۹۸۸) میں ان کا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مختلف مذاہب کا ذکر کیا اور کہا کہ ان سب پر بلڈوزر چلا دو:

Bulldoze them all (p.3).

احمد دیدات صاحب یا دوسرے مقرروں کے اس قسم کے الفاظ مسلمانوں کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ ان پر تالیاں بجاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی لفظ دوسرا شخص بولے تو وہ غصہ ہو جائیں گے۔ مثلاً ہندستان میں بال ٹھاکرے اگر یہ کہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بلڈوزر کر دو تو تمام مسلمان مشتعل ہو کر ہنگامہ کھڑا کر دیں گے۔ اس قسم کا دوطرفہ معیار موجودہ امتحان کی دنیا میں ہرگز چلنے والا نہیں۔

مسلمانوں کو یہ جاننا چاہیے کہ جو آزادی انھوں نے خود اپنے لیے لے رکھی ہے، وہ انھیں دوسروں کو بھی دینی پڑے گی۔ دوسروں کے لیے آزادی کا حق تسلیم نہ کرنے سے وہ دوسروں کو اس آزادی سے محروم

تو نہ کر سکیں گے جو انھیں خود زمانہ کی طاقت سے ملی ہوئی ہے۔ البتہ جھوٹے ردعمل کا مظاہرہ کر کے مسلمان اپنی اور بالواسطہ طور پر اسلام کی تضحیک کا سامان ضرور کرتے رہیں گے۔ اور موجودہ حالت میں وہ اپنی روش سے یہی کام انجام دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کو آزادیٔ خیال کا سب سے بڑا حامی اور وکیل ہونا چاہیے۔ کیونکہ آزادانہ مباحثہ میں بالآخر جو چیز باقی رہے گی وہ سچائی ہے، اور کامل اور بے داغ سچائی اسلام کے سوا کسی اور کے پاس موجود نہیں۔

زیادہ بڑی سزا

قدیم عرب میں شاعری کا وہی مقام تھا جو موجودہ زمانہ میں صحافت کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کسی بات کو پھیلانا ہو تو اس کو اخبار میں چھاپ کر پھیلایا جاتا ہے۔ قدیم عرب میں یہی کام اشعار کے ذریعہ لیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مکہ میں چند بڑے بڑے شاعر تھے، مثلاً کعب بن زُہیر، عبد اللہ بن الزبعریٰ اور ہُبیرہ بن ابی وہب۔ یہ لوگ اشعار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے اور آپ کو اذیت پہنچاتے تھے۔ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو یہ لوگ سزا کے ڈر سے مکہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہُبیرہ کفر کی حالت میں مر گیا۔ بقیہ دونوں نے بعد کو اسلام قبول کر لیا (سیرۃ ابن ہشام، رابع ۱۴۹)

جب یہ لوگ مکہ چھوڑ کر بھاگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ ان کے پیچھے اپنے آدمی دوڑائیں۔ یا یہ اعلان کریں کہ جو شخص ان کو قتل کرے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا۔ اس کے برعکس آپ نے ان کی ہدایت کے لیے دعا کی اور ایسے حالات پیدا کرتے رہے جس سے ان کا ضمیر جاگ اٹھے اور وہ توبہ کر کے اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ وہاں انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دونوں شاعروں نے بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری کا رخ ہجو کے بجائے مدح کی طرف پھیر دیا۔ ان کا اسلام قبول کرنا ایک طرف خود ان کی اپنی زبان سے ان کی ماضی کی باتوں کی تردید تھی، دوسری طرف یہ ہوا کہ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں جو اس سے پہلے مخالف اسلام محاذ پر استعمال ہو رہی تھیں وہ اب حمایتِ اسلام محاذ پر استعمال ہونے لگیں۔

۱۔ کعب بن زُہیر آخر وقت میں اپنے بھائی بجیر بن زہیر کی ترغیب پر مدینہ آئے تو انصار میں سے ایک شخص ان پر ٹوٹ پڑا اور کہا کہ اے خدا کے رسول مجھے اور اس دشمن خدا کو چھوڑ دیجئے کہ میں اس کی گردن ماردوں (یا رسول اللہ، دعنی وعدوَّ اللہ أضرب عنقہ، سیرۃ ابن ہشام، رابع ۱۵۲) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ انصاری کو خاموش کر کے بٹھا دیا۔ اور کعب بن زُہیر کو قتل کرنے کے بجائے ان کے لیے دعا فرمائی۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اس کے بعد کعب بن زُہیر نے اسلام قبول کر لیا۔ کعب بن زُہیر اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین ہجو گو شعراء میں سے تھے۔ مگر قبول اسلام کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح خواں بن گئے۔ انھوں نے آپ کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ لکھا جو قصیدہ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ قصیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ایک انتہائی ممتاز قصیدہ سمجھا جاتا ہے۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب میں اس کے ۵۹ شعر نقل کیے ہیں۔ (الجزء الرابع، صفحہ ۱۶۶-۱۵۲)

اس قصیدہ کا ایک مصرعہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ایک نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے:

إنّ الرسولَ لنورٌ یُستضاءُ بہ

ایک شخص جو پیغمبر اسلام پر عیب لگا رہا تھا، اگر پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی فاتحانہ طاقت اس طرح ظاہر ہو کہ وہ اس کو آپ پر ایمان لانے پر مجبور کر دے اور جو شخص اب تک آپ کی ہجو کر رہا تھا، وہ اپنی زبان سے یہ اعلان کرنے لگے کہ پیغمبر اسلام ہدایت کی روشنی ہیں، ان سے زندگی کے راستے روشن ہوتے ہیں، تو یہ بلاشبہ مذکورہ شخص کے قتل سے ہزار گنا زیادہ بڑا واقعہ ہے۔ یہ دشمن کی زبان سے پیغمبر اسلام کی صداقت کا اقرار ہے، اور بلاشبہ اس زمین پر اس سے زیادہ بڑا کوئی واقعہ نہیں کہ دشمن اپنی زبان سے اپنے حریف کی صداقت کا اقرار کرے۔

۲۔ عبد اللہ بن الزبعری مکہ کے ممتاز شعراء میں سے تھا۔ وہ نہایت ذہین ہونے کے ساتھ نہایت گستاخ بھی تھا۔ مکی دور کا واقعہ ہے۔ قرآن میں یہ آیت اتری کہ تم اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، سب کے سب جہنّم کا ایندھن بنیں گے (الانبیاء ۹۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ والوں کے سامنے یہ آیت پڑھ کر سنائی تو عبد اللہ بن الزبعری نے کہا کہ اے محمد، کیا جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی ہے، وہ سب اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنّم میں ہوں گے۔ تو ہم لوگ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہود عزیر پیغمبر کی عبادت کرتے ہیں اور نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کی عبادت کرتے ہیں۔

یہ بلاشبہ نہایت گستاخی کا فعل تھا۔ اپنے اس کلام کے ذریعہ اس نے خدا اور فرشتوں اور

رسولوں کا مذاق اڑایا تھا اور ان کی توہین کی تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سن کر مشتعل نہیں ہوئے، اور نہ ہی اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ اس آدمی نے ناقابل معافی جرم کیا ہے، اس کو قتل کر ڈالو۔ اس کے بجائے آپ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا:

جو کوئی یہ پسند کرے کہ اللہ کے سوا اس کی عبادت کی جائے تو وہ اسی کے ساتھ ہوگا جس نے اس کی عبادت کی (کل من احب ان یعبد من دون اللہ فھو مع من عبدہ ـــــ الجزء الاوّل صفحۃ ۳۸۳)

ابن الزبعری نے واضح طور پر استہزار اور اہانت کا جرم کیا تھا۔ مگر اس کے بعد آپ نے صرف یہ کیا کہ اس کو ایک ایسا معقول اور مدلّل جواب دیا کہ اس کی بات بالکل بے وزن ہو کر رہ گئی قتل صرف معترض کو ختم کرتا، مگر جوابی کلام نے معترض کا بھی خاتمہ کر دیا اور اسی کے ساتھ اس کے اعتراض کا بھی۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن الزبعری بھاگ کر نجران چلا گیا۔ کیونکہ اس کا ضمیر اس سے کہہ رہا تھا کہ تم نے ایسا جرم کیا ہے کہ اندیشہ ہے کہ تم قتل کر دیے جاؤ۔ تاہم اس کا یہ فرار اس کے لیے اطمینان کا سبب نہ بن سکا۔ اب وہ ایک ایسا انسان تھا جس نے یقین کو کھو دیا ہو اور شک اور تردد کی دلدل پر کھڑا ہوا ہو۔

عبداللہ بن الزبعری کے سلسلہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اس کے سر پر انعام مقرر کریں اور اپنے اصحاب سے کہیں کہ تم لوگ تلوار لے کر جاؤ اور جہاں بھی اس کو پاؤ، اسے قتل کر دو۔

اس کے برعکس مسلم حلقہ کی طرف سے یہ کوشش جاری رہی کہ اس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگایا جا سکے۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے شاعر حسّان بن ثابت الانصاری نے عبداللہ بن الزبعری کے بارہ میں کچھ تنبیہی اشعار کہے۔ یہ اشعار ابن الزبعری تک پہنچائے گئے۔ ان میں سے ایک شعر یہ تھا کہ تم ایسے آدمی (رسول) کو نہ کھوؤ جس کے بغض نے تم کو لے جا کر دور نجران میں ڈال دیا ہے، جہاں تم سب سے منقطع ہو اور غیر شریفانہ زندگی گزار رہے ہو:

لاتَفْدَمَنْ رجلاً اَحَلَّكَ بُغْضُهٗ نَجرانَ فی عَیشٍ اَحَـذَّ لَئِیْمِ

ابن الزبعری کو یہ شعر تیر کی طرح لگا۔ اس کے بعد وہ نجران سے چل کر مدینہ آیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد اس نے بہت سے اشعار کہے۔ ان اشعار میں اس نے کھلے طور پر اپنی ماضی کی غلطی کا اعتراف کیا۔ پہلے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کی تھی۔ اب وہ آپ کی اور آپ کے پیغام کی تعریف میں اشعار کہنے لگا۔ اس کے کچھ اشعار ابن ہشام نے اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں (الجزء الرابع، صفحہ ۳۹ - ۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ ہجو گو انسان کے اندر بھی ایک مدح گو انسان سویا ہوا ہوتا ہے۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ اس مدح گو انسان کو جگائیں، جیسا کہ دور اوّل کے اہلِ ایمان نے جگایا۔ ہجو گو انسان کو قتل کرنا اگر ایک انتقامی عمل ہے، تو مدح گو انسان کو جگانا ایک داعیانہ عمل۔ اور اس میں شک نہیں کہ انتقامی عمل کے مقابلہ میں داعیانہ عمل کہیں زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

ایک شخص جو پیغمبر اسلام کا مذاق اڑائے یا آپ پر اعتراض کرے، اس کی یہ سزا بالکل بے فائدہ ہے کہ اس کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا قتل مقتول کی بات کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ لوگوں کا تاثر یہ ہو جاتا ہے کہ اس نے ایک طاقتور بات کہی تھی۔ چونکہ اس کی بات کا علمی رد ممکن نہ تھا، اس لیے مجنونوں نے اس کو مار کر اس کے وجود کو ختم کر دیا۔

مزید یہ کہ تاریخ میں بہت سے سچے اور بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں جن کو وقت کے ظالموں نے قتل کیا ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مقتول کا رشتہ ان گزرے ہوئے لوگوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ وہ اس کو ہیرو بنا دیتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ پیش آیا ہے جو اس سے پہلے بے شمار سچے انسانوں کے ساتھ پیش آیا۔ اس طرح مخالفین کے ہاتھوں سے قتل ہونا اس کو "شہیدانِ حق" کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔

یہ کوئی فرضی بات نہیں۔ سلمان رشدی کے اعلان قتل کے بعد عملاً یہی بات پیش آئی ہے۔ مثال کے طور پر ٹائمس آف انڈیا (۵ مارچ ۱۹۸۹) میں ایک مضمون نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— مذہبی احتساب :

اس مضمون میں سلمان رشدی کو تاریخ کے ان بڑے بڑے لوگوں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے جن کو ان کے مخالفوں نے قتل کر دیا، یا قتل کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سقراط، مسیح، گلیلیو، مارٹن لوتھر، وغیرہ ۔۔ حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلامؐ، جن کو مکہ کے لوگوں نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مشہور سائنس داں گلیلیو کے انجام کا تذکرہ کرتے ہوئے اس مضمون میں یہ الفاظ درج کیے گئے ہیں کہ گلیلیو کو اپنی آخر عمر تک اپنے گھر کے اندر نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی مقدر رشدی کا آج ایک نئی صورت میں ہو سکتا ہے :

Gallileo was confined to his villa under strict house arrest for the rest of his life, a fate that could well be Rushdie's in a different sort of way today.

واقعہ یہ ہے کہ سب وشتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایک اعتراض ہے۔ اور جو شخص اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراض کرے، اس کی زیادہ بڑی سزا یہ ہے کہ اس کی بات کو دلیل کے ذریعہ رد کر دیا جائے۔ اس کو گولی مارنا اگر اس کا جسمانی قتل ہے تو اس کے اعتراض کو رد کرنا اس کا ذہنی قتل۔ اور جسمانی قتل کے مقابلہ میں ذہنی قتل بلاشبہ زیادہ سخت ہے، اور زیادہ کارگر بھی ۔۔۔

تیسرا باب

قول بلا فعل

۱۸ اپریل ۱۹۸۹ کو میری ملاقات ڈاکٹر عبدالسلام صاحب (پیدائش ۱۹۲۹) سے ہوئی۔ ان کا مضمون میتھمٹکس ہے اور وہ نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی، شکاگو میں پروفیسر ہیں۔ وہ تقریباً ۲۵ سال سے امریکہ میں رہ رہے ہیں:

Dr. Abdus Salam Ansari, 5647 N. Bernard Street, Chicago, IL, 60659, U.S.A. Tel. (312) 267-4740

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے بتایا کہ مارچ ۱۹۸۹ میں ان کی یونیورسٹی میں "رشدی آفئر" پر ایک سیمنار کیا گیا۔ یونیورسٹی کی مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے اس سیمنار کا نظم کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کہا وہ انہیں کے الفاظ میں یہ تھا:

A student in the meeting exclaimed that Rushdie should be killed for his crime. I reminded him that everybody should be serious when speaking. If he really believed that it is his duty to kill Rushdie, by now he would have been in London, and not here talking about it.

ایک طالب علم نے اس میٹنگ میں پُرجوش طور پر کہا کہ رشدی کو اس کے جرم کی بنا پر ضرور قتل کر دینا چاہیے۔ میں نے اس طالب علم کو یاد دلایا کہ ہر آدمی کو اپنے بولنے میں سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اگر فی الواقع وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ رشدی کو قتل کر دے تو اِس وقت اس کو لندن میں ہونا چاہیے، نہ کہ یہاں رہ کر وہ صرف قتل کرنے کی بات کر رہا ہو۔

یہ واقعہ علامتی طور پر ان تمام لوگوں کی تصویر ہے جو رشدی کی کتاب کی اشاعت کے بعد جوش و خروش کے ساتھ اس کو مارنے کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ لوگ اگر واقعتہً اپنے کلام میں سنجیدہ ہوتے تو ان میں سے کم از کم چند آدمی کتاب کی اشاعت کے بعد خاموشی سے لندن جاتے اور رشدی کا خاتمہ کر دیتے۔ (۱۹۹۲ میں ڈاکٹر عبدالسلام کا انتقال ہو گیا۔)

سلمان رشدی کی کتاب ستمبر ۱۹۸۸ میں شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں آیت اللہ خمینی کا

قتل کا فتویٰ فروری ۱۹۸۹ میں لوگوں کے سامنے آیا۔ اس کے بعد وہ شور وغل شروع ہوا جس کے نتیجہ میں برطانوی حکومت نے سلمان رشدی کو خفیہ مقام پر منتقل کر دیا اور اس کے اوپر خصوصی پہرہ بٹھا دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد تقریباً ۶ مہینے ایسے گزرے ہیں جب کہ سلمان رشدی ایک عام آدمی کی طرح تھا اور ہر شخص اس کے اوپر قابو پا سکتا تھا۔ مگر اس پوری مدت میں لفظی بیان کے سوا کسی مسلمان نے کچھ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سلمان رشدی روپوش ہو کر پولیس کے خصوصی پہرہ میں چلا گیا۔

خود ایران کے آیت اللہ خمینی کو اس معاملہ میں سنجیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ سنجیدہ ہوتے تو یقیناً وہ وہی کرتے جو اس طرح کے مواقع پر دوسرے لوگ ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع سنجیدہ ہوتے تو اخباری اعلان کے بجائے وہ ایسا کرتے کہ ایک یا چند آدمی کو نہایت خاموشی کے ساتھ انگلینڈ روانہ کرتے اور اسی کے ساتھ ان کے گھر والوں کو اتنی رقم دے دیتے کہ بحالت ضرورت وہ اپنی آئندہ معاش کے لیے مطمئن ہو جائیں۔ مگر آیت اللہ خمینی نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے وہ اخبار اور ریڈیو پر اپنے قتل کے فرمان کو نشر کرنے لگے۔ گویا ان کی اصل دلچسپی اپنے فرمانِ قتل کی پبلسٹی سے تھی نہ کہ خود رشدی کے قتل سے۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت اللہ خمینی سمیت، ان کے جیسی بولی بولنے والے تمام مسلمان اس معاملہ میں سخت غیر سنجیدہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مارنا نہیں ہے، بلکہ صرف مارنے کی باتیں کرنا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو مارتے ہیں وہ شور نہیں کرتے، اور جو شور کرتے ہیں وہ کبھی مارتے نہیں۔

سلمان رشدی کی روپوشی یا اس کا پولس کی حفاظت میں ہونا اس کے خلاف اقدام کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ صیہونی یہودی بہت سے فلسطینی لیڈروں یا فلسطین نوازوں کو ٹھیک اسی قسم کی رکاوٹوں کے باوجود ہلاک کر چکے ہیں۔ پھر رشدی کے خلاف شور وغل کرنے والے مسلمان اپنے اعلان کے باوجود ایسا کیوں نہ کر سکے۔

راقم الحروف قتل کے نعرہ کو ایک لغو اور غیر سنجیدہ فعل سمجھتا ہے۔ اسلام تو درکنار، عقل و دانش سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ تاہم جو لوگ اس کو عین دین و ایمان سمجھتے ہیں وہ آخر کس

لیے صرف للکارنے پر قانع ہیں۔ وہ خود آگے بڑھ کر اس کے لیے اقدام کیوں نہیں کرتے، یا اپنے صاحبزادوں کو اس مہم پر کیوں نہیں روانہ کرتے۔

یہ مسلمان اگر رشدی کو قتل نہیں کر سکتے تھے تو اس کوشش میں وہ اپنے آپ کو شہید تو کر سکتے تھے۔ مگر وہ نہ قاتل بن سکے اور نہ شہید۔ کس قدر حیرت ناک بات ہے کہ "رشدی کو قتل کرو" کا نعرہ لگانے والوں میں سے کسی ایک شخص کے بارے میں بھی یہ خبر نہیں آئی کہ وہ رشدی کو قتل کرنے کے لیے خفیہ طور پر لندن پہنچا تھا، لیکن وہاں کی پولس نے اس کا سراغ لگا کر اس کو گرفتار کر لیا۔ اگر برطانیہ کی پولس رشدی کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے تو قتل کا نعرہ لگانے والے مسلمانوں یا ان مسلمانوں کی اولاد میں سے کچھ ایسے لوگ کیوں نہیں نکلے جو مجاہدانہ عزم کے ساتھ لندن پہنچتے۔ وہاں وہ رشدی کی قیام گاہ کو تلاش کرتے، اور جان پر کھیل کر رشدی کو قتل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے بعد وہ یا تو غازی بنتے یا اسی راہ میں شہید ہو جاتے۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ قتل کے لیے للکارنے والے تمام لوگ، خواہ وہ آیت اللہ خمینی کا خاندان ہو یا اخباروں میں خطوط اور مضامین شائع کرنے والے عام مسلمانوں کا خاندان، سب کے سب اطمینان وسکون کے ساتھ اپنے گھروں اور اپنے دفتروں میں بیٹھے رہے، ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس سنجیدگی کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ خود ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے کر لندن پہنچے یا اپنے صاحبزادے کو اس مہم پر روانہ کرے۔ ڈاکٹر عبد السلام صاحب نے امریکہ کے مسلم نوجوان کے بارے میں جو بات کہی، وہی ان تمام مسلمانوں کے بارے میں صحیح ہے جو رشدی کے قتل کی وکالت کر رہے تھے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ یہ تمام کے تمام مسلمان صرف لفظوں کے بادشاہ ہیں، ان میں سے کوئی بھی شخص عمل کا بادشاہ نہیں۔ یہ بلاشبہ بے حد تشویش ناک بات ہے۔ کیونکہ یہ عین وہی اخلاقی کمزوری ہے جس کو قرآن میں قول بلا فعل کہا گیا ہے۔ اور قول بلا فعل کے متعلق قرآن کا اعلان ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک سخت ناراضگی کی بات ہے، وہ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کی بات نہیں۔ (الصف ۳)

سورہ الصف کی اس آیت کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں: بندہ کو لاف زنی اور دعوے کی بات سے ڈرنا چاہیے کہ پیچھے مشکل پڑتی ہے، زبان سے ایک بات کہہ دینا آسان ہے، لیکن

اس کا نباہنا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے سخت ناراض اور بیزار ہوتا ہے جو زبان سے کہے بہت کچھ اور کرے کچھ نہیں (صفحہ ۱۵۷)

کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ مسلمانوں میں سے بے شمار لوگوں نے "رشدی کو قتل کرو" کے نعرے لگائے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک شخص نہ تھا جو جان پر کھیل کر رشدی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ یہ سب کے سب جھوٹے الفاظ بولنے والے لوگ تھے۔ ان میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو سچا لفظ بولنے والا ہو۔ کیونکہ سچے لفظ اور عمل کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جھوٹے الفاظ پر اسلام کا مینار کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جھوٹے الفاظ پر تو کفر کو بھی کھڑا نہیں کیا جا سکتا، اسلام کو کھڑا کرنا تو درکنار۔

سامان تضحیک

انگلینڈ میں قدیم زمانہ سے ایک قانون ہے جو مذہبی بے حرمتی (Balsphemy) سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قانون سترہویں صدی میں بنایا گیا۔ عیسائیت (انگلیکن چرچ کی تشریح کے مطابق) انگلینڈ کا سرکاری مذہب ہے۔ اس قانون سازی کی وجہ، بنیادی طور پر، یہ تھی کہ یہ سمجھا گیا کہ مذہب پر حملہ لازمی طور پر خود ریاست پر حملہ ہے:

An attack on religion is necessarily an attack on the state (II/75).

موجودہ حالت میں اس قانون کا تعلق صرف عیسائی مذہب سے ہے۔ برطانیہ کے مسلمان (زیادہ صحیح الفاظ میں، برطانیہ میں مقیم کچھ ہندستانی مسلمان) وہاں یہ مہم چلا رہے ہیں کہ مذکورہ قانون میں وسعت پیدا کر کے اس کو مسلم مذہب تک وسیع کیا جائے، تاکہ اس کے تحت سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکے۔

میرے نزدیک یہ مطالبہ بالکل لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف جھوٹی لیڈری ہے، ورنہ خود مطالبہ کرنے والے بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس طرح کے قوانین کا عملی طور پر مطلق کوئی فائدہ نہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہ انتہائی سطحیت بھی ہے۔ مسلم ملکوں میں اسلام یا اسلامی شخصیتوں کی بے حرمتی

کے خلاف قوانین موجود ہیں۔ کیا مسلمان اس کے لیے راضی ہوں گے کہ ان قوانین کو عیسائیت، ہندوازم اور یہودیت تک وسیع کیا جائے۔ خواہ اس کے تحت دوسرے مذاہب کے لوگوں کو موقع ملے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مقدمات قائم کرسکیں کہ انھوں نے ان کے مذہب کی بے حرمتی کی ہے۔ مسلمان جو حق اپنے ملک میں دوسروں کو نہیں دے سکتے، اس حق کو دوسروں کے ملک میں اپنے لیے مانگنا بلاشبہ صرف سطحی لیڈری ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اس احمقانہ مہم نے اسلام کے خلاف بے حرمتی کا تحفظ تو نہیں کیا۔ البتہ اس نے اسلام کی بے حرمتی کے اسباب ضرور فراہم کر دیے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ برطانیہ کے کچھ نام نہاد مسلم لیڈروں نے حکومت برطانیہ کو خط لکھ کر مطالبہ کیا تھا کہ حکومت مذکورہ قانون کو اسلام کی بے حرمتی تک وسیع کرے۔ اس کے جواب میں برطانیہ کے ہوم آفس کے منسٹر آف اسٹیٹ مسٹر جان پیٹن (John Patten) نے انھیں ایک خط بھیجا ہے۔ یہ خط ٹائمس آف انڈیا (۶ جولائی ۱۹۸۹) کے آخری صفحہ پر چھپا ہے۔

یہ رپورٹ جو پی ٹی آئی نے لندن سے روانہ کی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ کے مسلم لیڈروں کے نام ایک خط میں مسٹر پیٹن نے کہا کہ قانونی مشین مذہب اور انفرادی عقیدہ کے معاملات سے نمٹنے کے لیے غیر موزوں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود عیسائی مذہب اب اس قانون پر اعتماد نہیں کرتا۔ عیسائی لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کے مذہب کی اپنی طاقت اس قسم کے حملوں کے مقابلہ میں بچاؤ کا بہترین ذریعہ ہے:

> In a letter to prominent British Muslim Leaders, Mr Patten said "Legal mechanisms were inappropriate for dealing with matters of faith and individual beliefs. Indeed, the Christian faith no longer relies on it, preferring to recognise that the strength of their own belief is the best armour (p.10).

برطانیہ کے عیسائی ہوم سکریٹری کے الفاظ مسلمانوں کے اوپر گہرا طنز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ——— ہمارا مذہب اتنا طاقتور ہے کہ بے حرمتی کے خلاف قانون کے ہوتے ہوئے بھی ہم اس کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ دوسری طرف تمہارا یہ حال ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے مذہب کی حرمت اسی وقت محفوظ رہ سکتی ہے جب کہ اس کی پشت پر قانون اپنا ڈنڈا لیے ہوئے اس کی چوکیداری کر رہا ہو۔

متفرقات

سلمان رشدی اور شتم رسول کے موضوع پر کچھ متفرق چیزیں جو راقم الحروف نے مختلف مواقع پر کہیں یا لکھیں، ان کو اگلے صفحات میں الگ الگ عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ اختصار کے پیش نظر یہاں صرف کچھ منتخب چیزیں ہی نقل کی جارہی ہیں۔

اخباری بیان

۱۷ فروری ۱۹۸۹ کے اخبارات میں یہ سنسنی خیز خبر تھی کہ ایران کے آیت اللہ خمینی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ "شیطانی آیات" کے مصنف سلمان رشدی کو قتل کر دیں۔ اسی کے ساتھ ایرانی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ قاتل کو اس کے معاوضہ میں ایک بڑا انعام ادا کرے گی۔ قومی آواز (۲۰ فروری ۱۹۸۹) کے مطابق، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے امام خمینی کی تائید کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ امام خمینی اس اعلان میں حق بجانب ہیں۔ اسلام میں پیغمبر اسلام کی توہین کے مجرم کی سزا یہی ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔

سلمان رشدی نے اگر پیغمبر اسلام کی توہین کی تھی تو میرے نزدیک امام خمینی اور مولانا ندوی جیسے لوگ اسلامی قانون کی توہین کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح کسی کو قتل کروانا ہرگز اسلام کا طریقہ نہیں۔

اسلام میں ہر قانونی سزا عدالتی معاملہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی شخص اگر ایسا جرم کرتا ہے جو اسلامی شریعت میں قابل سزا ہے تو کسی شخص یا اشخاص کو ہرگز یہ حق نہیں کہ وہ بطور خود اس پر سزا کا نفاذ کرنے لگے۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مجرم کو پکڑا جائے اور عدالتی کارروائی کے بعد قاضی کے فیصلہ کے مطابق اس کو وہ سزا دی جائے جو شریعت میں ایسے مجرم کے لیے مقرر ہے۔

دوسری بات یہ کہ سلمان رشدی برطانیہ کا باشندہ ہے۔ اس پر برطانیہ کے قوانین نافذ ہوتے ہیں نہ کہ ایران یا پاکستان کے۔ انعام دے کر یا جذباتی اپیل کر کے اس طرح ایک غیر ملکی کو مروانا گویا انٹرنیشنل بدامنی کو جواز فراہم کرنا ہے۔ اسلام بلاشبہ اس سے بری ہے۔

سلمان رشدی کی کتاب نے تو اسلام کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر شیعہ اور سنی

علماء جو کچھ کر رہے ہیں وہ بلاشبہ اسلام کو زبردست نقصان پہنچانے کا سبب بنا ہے۔ اس نے اسلام کے دعوتی امکانات کو ناقابل تلافی حد تک برباد کر دیا ہے۔ ان حضرات نے اپنی ان حرکتوں سے دنیا کو یہ بتایا ہے کہ اسلام وحشت و بربریت کا مذہب ہے۔ اور جس مذہب کی تصویر وحشت و بربریت کی تصویر بنا دی جائے، اس کو کون اپنے لیے پسند کر سکتا ہے۔

اسلام میں دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ دعوت کی مصلحت اہم ترین مصلحت کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ بار بار ایسے اقدامات کرتے ہیں جس سے انہیں ذاتی طور پر قیادتی فائدہ تو ضرور ملتا ہے، مگر اسلام کے دعوتی امکانات برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑا المیہ ہے جس سے اسلام کی جدید تاریخ دوچار ہے۔

(شائع شدہ ہفت روزہ نئی دنیا، ۳-۹ مارچ ۱۹۸۹)

ایک ملاقات

۲۵ فروری ۱۹۸۹ کو دو امریکی پروفیسر (ایک مرد، ایک عورت) اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے اسلامی مرکز کی کچھ انگریزی مطبوعات حاصل کیں اور راقم الحروف سے اسلام کے بارہ میں تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Dr Peggy Starkey, Dr. Archie L. Nations
12228, Old Creedmoor Road, Raleigh, North Carolina 27613
Telephone: (919)846-8377 (U.S.A.)

اس ملاقات کے آخر میں انھوں نے رشدی۔خمینی معاملہ میں بھی راقم الحروف کی رائے دریافت کی۔ میں نے کہا کہ سلمان رشدی کے قتل کا "فتوی" اگرچہ شیعہ امام آیت اللہ خمینی نے دیا ہے۔ مگر سنّی علماء بھی اس میں شریک ہیں۔ کچھ علماء (مولانا ابو الحسن علی ندوی) نے براہ راست اخباری بیان کے ذریعہ اس سے اتفاق کیا ہے۔ دوسرے علماء جو خاموش ہیں، وہ بھی عملاً اس فتوی میں شریک قرار دیے جائیں گے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات میں خاموشی بالواسطہ تائید کے ہم معنی ہوتی ہے۔

میں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر اس فتوی سے صد فی صد اختلاف ہے۔ میں اس کو بالکل ناجائز اور غیر اسلامی سمجھتا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے جو باتیں کہیں، ان کا اردو خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

آیت اللہ خمینی نے کہا ہے کہ سیٹینک ورسز کے مصنف سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے۔ بہت سے سنّی علماء نے بھی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس کی تائید کی ہے۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صد فی صد غلط ہے۔

۱۔ سلمان رشدی کیوں اس قابل ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ عام طور پر اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ توہین رسول یا توہین اسلام کے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ سلمان رشدی کی کتاب میں کچھ "واقعات" کو افسانہ کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً تلک الغرانیق العُلیٰ کا قصہ، یا حضرت عائشہ (زوجہ رسول) کو صفوان بن معطّل کے ساتھ ملوث کرنے کا قصہ۔ یہ سب قصے پرانے ہیں۔ سلمان رشدی ان کا خالق نہیں ہے۔ سلمان رشدی نے دوبارہ ان واقعات کو ناول کے پیرایہ میں بیان کر دیا ہے۔ پھر جن قصوں کے مصنف اول کو قتل کی سزا نہیں دی گئی، ان کے مصنف ثانی کو کیوں قتل کی سزا دی جائے گی۔

۲۔ اسلام میں کسی جرم کی جو سزا مقرر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی شخص اٹھے اور بطور خود اس کو لوگوں کے اوپر نافذ کرنا شروع کر دے۔ اسلام میں ہر سزا عدالتی سزا ہے۔ اگر سلمان رشدی نے ایسا جرم کیا ہو جو اسلامی شریعت میں موجب قتل ہے، تب بھی اس کا نفاذ اس طرح نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص بندوق لے کر اس کے پاس جائے اور خود اپنے فیصلہ کے تحت اس کو گولی مار دے۔ شرعی جرم کے ارتکاب کے بعد بھی ضروری عدالتی کارروائی کرنا لازمی ہے۔ ضروری عدالتی کارروائی کے بغیر کسی شخص کو قتل کرنا سراسر ناجائز اور غیر اسلامی فعل ہوگا۔

۳۔ اسلام میں مختلف جرموں کی جو سزائیں مقرر ہیں، ان کا نفاذ صرف مملکت اسلامی میں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اسلام میں چوری کرنے والے کے لیے ایک سزا مقرر کی گئی ہے۔ مگر عملی نفاذ کے اعتبار سے اس کا تعلق صرف اسلامی حکومت کے دائرہ سے ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلمان دوسرے ملکوں میں جائیں اور وہاں جس کو چور سمجھیں اس پر بطور خود اسلامی سزا کا نفاذ شروع کر دیں۔ اب چونکہ سلمان رشدی ایک غیر مسلم ملک (برطانیہ) کا شہری ہے، وہ اسلامی سزا کے دائرہ سے باہر ہے۔ یہ سراسر غیر اسلامی فعل ہوگا کہ کوئی شخص ایران یا پاکستان سے برطانیہ جائے اور وہاں سلمان رشدی کو گولی مار کر یہ کہے کہ اس نے اس کے اوپر اسلامی قانون کا نفاذ

Dr. Peggy Starkey
Dr. Archie L. Nations
12228 Old Creedmoor Road
Raleigh, N.C. 27613
March 27, 1989

Wahiduddin Khan, President
The Islamic Centre for Research and Dawah
C-29, Nizamuddin West
New Delhi-110 013
India

Dear Mr. Khan:

When we think of our time in Delhi, our minds immediately reflect on our visit with you and your son, Dr. Khan, who so graciously assisted us while we were there. We are profoundly indebted to you for granting us time to talk with you and to learn about the Muslim faith in India.

Most of all, we are encouraged by the fact that there are Muslim religious leaders like you whose wise counsel needs to be taken very seriously, not only by the Muslim people but also by persons of other religious traditions as well. We think that the hope for inter-cultural and international understanding and peace lies in the directions charted by such wisdom. We are, therefore, most grateful for the opportunity to meet you and to talk with you. You have strengthened our resolve to continue our efforts in Muslim-Christian dialogue in the U.S. with a view toward the dissemination of an accurate knowledge of Islam and better relations with Muslims.

We appreciate your sharing with us your thoughts concerning the Rushdie controversy, and we thank you for giving us the articles and pamphlets which you have written. If there is some way that we might receive information about your future publications and how we might obtain them, we would be most grateful.

Sincerely yours,

Peggy Starkey
Archie L. Nations

Peggy Starkey
Archie L. Nations

یہ امریکی پروفیسروں کے اس خط کی نقل ہے جو انھوں نے اپنے وطن واپس پہنچنے کے بعد راقم الحروف کے نام روانہ کیا تھا۔

کیا ہے۔ اس قسم کا ہر فعل سرکشی ہے نہ کہ اسلامی قانون کا نفاذ۔

۴۔ سلمان رشدی کے خلاف مسلمان اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کو لازماً پُرامن دائرہ تک محدود رہنا چاہیے۔ مثلاً مضمون یا کتاب کی صورت میں اس کی تردید کرنا۔ مسلم ملکوں میں اس کی اشاعت اور تقسیم پر پابندی لگانا۔ دوسری حکومتوں سے پُرامن قانونی دائرہ میں مطالبہ کرنا۔ وغیرہ۔ اس سے آگے کسی بھی قسم کی جارحیت اسلامی اعتبار سے جائز نہیں۔ اس معاملہ میں مسلمان اگر جارحانہ انداز اختیار کریں تو یقینی طور پر وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے کے ہم معنی ہوگا۔

ایک خط کا جواب

راجوری (کشمیر) سے ڈاکٹر مظفر شاہین نے اپنے ایک مفصل خط میں لکھا تھا: "جب سے سلمان رشدی کی کتاب شائع ہوئی، وہ اخباروں اور رسالوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ تمام دنیائے اسلام میں عالم محشر بپا کر دیا گیا۔ حتی کہ رہنماؤں کے احتجاج سے متاثر ہو کر اسلام آباد، سرینگر اور بمبئی وغیرہ میں فسادات رونما ہوئے۔ لیکن کہیں بھی کسی مسلم عالم نے اس کتاب کا عقلی اور علمی دلائل سے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ کتاب دراصل ہمارے علماء کے لیے ایک چیلنج ہے نہ کہ عام معنوں میں اسلام کی تذلیل۔ چنانچہ آج تک کسی مسلم عالم کی طرف سے اس کتاب کی مدلل تردید نظر سے نہیں گزری۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھ کر اس کے بیانات سے متاثر ہوئے ہوں گے، کیا ہمارا شور وغل ان کے تاثر کا علاج بن سکتا ہے"۔

اس خط کے جواب میں میں نے لکھا کہ یہ بلاشبہ بے حد اہم بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف سلمان رشدی کی کتاب سے نہیں ہے بلکہ اس طرح کی تمام چیزوں سے ہے۔ مسلم علماء اور رہنماؤں کا عام طریقہ یہ ہے کہ جب اس قسم کی کوئی کتاب چھپتی ہے تو وہ اس کے خلاف پُرشور بیانات دیتے ہیں اور عوامی ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ مگر اصل کتاب کا مدلل جواب نہیں دیتے۔

مجھے اس بات سے صد فی صد اتفاق ہے کہ ایسا ہر واقعہ اسلام کی اہانت سے زیادہ خود ہمارے لیے ایک چیلنج ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کے مخالفین اشعار کے ذریعہ اسی قسم کی توہین آمیز اور دل آزار باتیں کرتے تھے جو موجودہ زمانہ کے مخالفین کرتے ہیں۔ مگر اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یا صحابہ کرام کا وہ ردعمل نہیں ہوتا تھا جس کا مظاہرہ

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کر رہے ہیں۔ اس کے بجائے مسلمانوں میں سے وہ لوگ کھڑے ہوتے تھے جو شعر اور خطابت کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ دلائل کی زبان میں مخالفین کا جواب دیتے تھے۔ یہی اس طرح کے معاملات میں اسلامی طریقہ ہے اور یہی موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کو اختیار کرنا چاہیے۔

قدیم عرب میں خبر رسانی (Communication) کا سب سے بڑا ذریعہ شاعری تھی۔ جس خیال کو عوام تک پہنچانا مقصود ہوتا اس کو منظوم کلام کی صورت میں مرتب کر دیا جاتا تھا جو سننے والوں کو بآسانی یاد ہو جاتا تھا۔ لوگ اس منظوم کلام کو لے کر جگہ جگہ سناتے تھے۔ اس طرح وہ بات سارے عوام میں پھیل جاتی تھی۔

موجودہ زمانہ میں پریس کی ایجاد نے شاعری کی یہ اہمیت ختم کر دی ہے۔ اب خبر رسانی کا سب سے بڑا ذریعہ صحافت ہے۔ موجودہ زمانہ میں جس فکر کو عوام تک پہنچانا مقصود ہو اس کو مرتب کر کے اخبارات میں شائع کر دیا جاتا ہے۔ یہ اخبارات پریس کے ذریعہ چھپ کر کثیر تعداد میں لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

دور اول کے مسلمانوں نے خبر رسانی Communication کے قدیم ذریعہ (شاعری) کو استعمال کر کے مخالفین کی باتوں کی تردید عوام تک پہنچائی تھی۔ موجودہ زمانہ میں یہی کام ہم کو اخبار (یا کتاب) کے ذریعہ کرنا چاہیے۔ مسلم رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ ایسے مواقع پر ایسا نہ کریں کہ وہ اسلام کی اہانت اور ناموس رسول پر حملہ جیسے الفاظ بول کر عوام کو بھڑکائیں۔ یہ طریقہ ایک اعتبار سے بدعت ہے۔ اس سے مسلم عوام تو بھڑک جاتے ہیں مگر مخالفین کی باتوں کی تردید نہیں ہوتی۔ مخالفین کی باتیں بدستور لوگوں کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ اس کے بجائے مسلم رہنماؤں کو سنّت کے طریقہ پر عمل کرنا چاہیے۔ یعنی اخبار کا جواب اخبار سے اور کتاب کا جواب کتاب سے دینا چاہیے۔ اور وہ بھی اسلامی اخلاق اور علمی دلائل کی روشنی میں ہو نہ کہ محض سب وشتم کے انداز میں۔ مسلم رہنما اگر اس انداز پر عمل کریں تو وہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کی خدمت کریں گے۔

غلط ترجمانی

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات۔ (The Satanic Verses) پر موجودہ لکھنے اور بولنے والے مسلمانوں نے جس شدت کے ساتھ غصہ کا اظہار کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال غالباً جدید دور

میں نہیں ملے گی۔ اردو، انگریزی، عربی اور دوسری زبانوں میں اس کے خلاف کثرت سے بیانات اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ان سب کا خلاصہ وہ ہے جو مسلمانوں کے ایک ترجمان نے ٹائمس آف انڈیا (یکم مارچ ۱۹۸۹) میں ان الفاظ میں بتایا ہے۔ دوسرے کسی بھی انسان کی طرح، ہم مسلمانوں کے جذبات کو اس وقت سخت ٹھیس لگتی ہے جب کہ ہماری محبوب شخصیتوں کو طوائف کے روپ میں دکھایا جائے :

We, Muslims, like any human being, should be entitled to feel offended when our dearest ones are depicted as prostitutes.

اس عبارت میں ایک واضح غلطی موجود ہے۔ وہ یہ کہ اس میں مسلمانوں کے ردعمل کے لیے عام انسانوں کے ردعمل کو نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کے لیے نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت میں ہے نہ کہ عام انسانوں کی روش میں۔

رسول کی ایذا رسانی پر مسلمانوں کا ردعمل کیا ہو، یہ ایک خالص دینی معاملہ ہے۔ اس کا تعین قرآن وسنّت کی روشنی میں کیا جائے گا نہ کہ عام انسانوں کے سلوک کی روشنی میں۔ اس کے لیے نمونۂ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک ہے نہ کہ عام انسانوں کا سلوک۔

سلمان رشدی نے اپنی کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی بیویاں ہونے کا مذاق اڑایا ہے اور آپ کے گھر کو، نعوذ باللہ، قحبہ خانہ (Brothel) کا نام دیا ہے (صفحہ ۳۷۶) اسی طرح مصنف نے صفوان بن معطّل کی جھوٹی کہانی کو دہرایا ہے جس میں نعوذ باللہ، حضرت عائشہ کے کردار کو داغدار بتایا گیا تھا (صفحہ ۳۸۷)

امّ المومنین کے بارہ میں یہ فرضی کہانی کوئی نئی کہانی نہیں۔ یہ اولاً ۱۴۰۰ سال پہلے مدینہ میں گھڑی گئی۔ اس کا مصنف اول عبداللہ بن ابی تھا جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا۔ اس کے مجرم ہونے کا ذکر خود قرآن (النور ۱۱) میں موجود ہے۔ سلمان رشدی نے اسی کہانی کو بلا تردید لیا ہے، کیونکہ وہ اس کے مجرمانہ مقصد کے لیے بہت زیادہ مفید مطلب تھی۔

اس سے واضح ہے کہ ام المومنین کے بارہ میں سلمان رشدی نے جو مجرمانہ فعل کیا ہے، اس

جرم کا ارتکاب خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ یہ ارتکاب جرم اس وقت ہوا جب کہ پیغمبر اسلام کو مجرم کے اوپر پوری طرح حاکمانہ اختیار حاصل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے ہر اعتبار سے نمونہ ہے، اس لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آپ نے اس وقت مذکورہ جرم کے مجرم کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا۔

تاریخ واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس مجرم اول (عبد اللہ بن ابی) کو اس کے جرم پر کوئی سزا نہیں دی گئی۔ حضرت عمر فاروق نے، حتی کہ خود مجرم کے بیٹے عبد اللہ نے، اس کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ترین اذیت کے باوجود، اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ ایک ثابت شدہ مجرم ہے، اس کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ آپ اس کو چھوڑے رہے، یہاں تک کہ طبعی موت سے اس کا انتقال ہو گیا۔

یہ ہے وہ نمونہ جو اس طرح کے معاملات میں پیغمبر اسلام نے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ ہمیں اسی نمونہ کو اختیار کرنا ہے۔ عام انسانوں کی روش کا حوالہ دے کر ہنگامہ آرائی کرنا سرکشی کی بات ہے نہ کہ ایمان و اسلام کی بات۔

سلمان رشدی کی کتاب کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے جو لایعنی ہنگامے کیے اس کو دوسرے انسانوں کی روش کا حوالہ دے کر صحیح بتانا لغویت کی حد تک غیر اسلامی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے رسول خدا کے عمل میں نمونہ ہے نہ کہ دوسرے انسانوں کے عمل میں۔

ایک تبصرہ

ایک عربی ادیب سلمان رشدی کے معاملہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ایک مسلمان اس وقت بھڑک اٹھتا ہے اور غضب ناک ہو جاتا ہے جب کہ اس کے والد یا والدہ کی اہانت کی جائے تو وہ اس ہستی کی اہانت پر کیوں نہ بھڑک اٹھے گا جو مرتبہ میں سب سے بڑا ہے اور محبت اور وفاداری کا سب سے زیادہ مستحق ہے (اذا کان الرجل المسلم یثور و یغضب اذا أهین والده أو والدته فکیف لا یثور للذی هو أعظم منزلة و احق بالمحبة والوفاء۔ أیدعی المسلم بعد ذلك وفیا للاسلام؟) البعث الاسلامی، جون ۱۹۸۹، صفحہ ۸۵

اس کے بعد اس عربی مضمون میں کہا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں دینی غیرت ختم ہو گئی ہے۔

اسی لیے ہم یہ افسوسناک منظر دیکھ رہے ہیں کہ سلمان رشدی نے اہانت رسول کا اتنا بڑا واقعہ کیا مگر مسلمان اس پر اتنا غضبناک نہیں ہوئے جتنا غضب ناک اس طرح کے واقعہ پر ہونا چاہیے۔

کلام کا یہ انداز سراسر لغو ہے۔ اس قسم کے جذباتی انداز کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔ یہ صحیح ہے کہ اہانت کے واقعہ سے آدمی کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ مگر کوئی بھی شریف اور سنجیدہ آدمی ایسا نہیں کرتا کہ جب بھی کوئی اہانت کا واقعہ ہو تو وہ غضب ناک ہو کر ہنگامہ آرائی کرنے لگے یا اہانت کرنے والے شخص کے قتل کے درپے ہو جائے۔ ایک بے مقصد آدمی ہی اس قسم کا جذباتی طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔ بامقصد آدمی اس طرح کی جہالت کو ہمیشہ اعراض کے خانہ میں ڈالتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) کے معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والوں نے اسی قسم کا منفی اور جذباتی انداز بیان اختیار کیا ہے جس کی ایک مثال اوپر نقل کی گئی۔ مگر یہ انداز کلام درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی کی ماں کے بارے میں توہین آمیز کلمات کہے جائیں تو اس کو سن کر فوری طور پر اس کو قلبی تکلیف ہوگی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی جب ایسا نازیبا کلام سنے تو اس کے بعد فوراً وہ کہنے والے سے لڑنے لگے، یا اس کے قتل کے درپے ہو جائے۔ ایسے مواقع پر آدمی کا متاثر ہونا بلاشبہ فطری ہے۔ مگر ایسے آدمی کو "جہنم رسید" کرنے کا منصوبہ بنانا بھی یقیناً غیر فطری اور نادرست ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام فلسطین کی ایک خاتون کے بطن سے باپ کے بغیر پیدا ہوئے۔ یعنی ان کی ایک ماں تھی، مگر ان کا کوئی انسانی باپ نہ تھا۔ اس پر فلسطین کے یہودیوں نے آپ کی والدہ پر، نعوذ باللہ، بدکاری کا الزام لگایا۔ اور حضرت مسیح کو ولد الزنا کہا۔ مگر حضرت مسیح نے ایسا نہیں کیا کہ ایسے لوگوں کے لیے قتل کا فرمان جاری کر دیں، حضرت مسیح کو خصوصی معجزاتی طاقتیں حاصل تھیں۔ وہ زندہ کو مُردہ اور مُردہ کو زندہ کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ جن لوگوں نے آپ کی یا آپ کی والدہ محترمہ کی اہانت کی تھی، ان کو مارنے اور ہلاک کرنے کی مہم شروع کر دیں۔

اسی طرح اسلام کے دورِ اول میں مدینہ کے منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ پر نعوذ باللہ بدکاری کا الزام لگایا اور اس کو عوام کے درمیان خوب پھیلایا۔ حضرت عائشہ نہ صرف پیغمبر اسلام کی اہلیہ تھیں

بلکہ ان کی حیثیت ام المومنین کی تھی، وہ تمام مسلمانوں کے لیے مقدس ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔ مگر مدینہ میں، اقتدار و اختیار کے باوجود ایسا نہیں کیا گیا کہ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہی تمام مجرمین کو پکڑا جائے اور ان کا سر کاٹ کر شہر کی دیواروں پر لٹکا دیا جائے۔ پھر جب رسول اور اصحاب رسول نے ایسا نہیں کیا تو بعد کے مسلمان کس دلیل سے اس قسم کا فعل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

ملاحظات

اخبار میں مولانا میرٹھی کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "رشدی کا شیطانی ناول"۔ اس مراسلہ کا ایک حصہ یہ ہے:

"بدنام زمانہ رشدی کا شیطانی ناول آج کل مذہبی دائروں سے نکل کر سیاسی حلقوں میں بھی بحث و مباحثہ اور ہنگاموں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے، مسلمان حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات کی بہترین شخصیت مانتے ہیں۔ وہ ہر بات برداشت کر سکتے ہیں، مگر حضور کی توہین اور آپ کی شان میں گستاخی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں علامہ خمینی کا اقدام قابل تعریف ہے۔ اور حضرت مولانا علی میاں کا بیان صداقت و حقیقت کا آئینہ دار ہے۔"

قومی آواز، ۲۷ فروری ۱۹۸۹

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا اصل پہلو آپ کا "اسوہ" ہونا بتایا گیا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے آپ کی ذات کا اصل پہلو آپ کا "اعظم" ہونا قرار دے لیا ہے۔ یہی انحراف ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ رسول کو اگر آپ اسوہ اور نمونہ سمجھیں تو اس سے پیروی کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے اگر آپ رسول کو اعظم و اکبر سمجھیں تو اس سے فخر کا ذہن ابھرے گا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ مظہر پوری طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کرنے کا جذبہ تو بالکل مفقود ہے۔ حقیقی اتباع رسول سے ان کے اکابر بھی خالی ہیں اور ان کے اصاغر بھی۔ البتہ آپ کو شہنشاہِ کونین، سرور کائنات اور فخر موجودات کہہ کر اس پر فخر کرنے کا جذبہ اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کی خاطر وہ ساری دنیا میں دھوم مچانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

حتی کہ اپنے پیغمبرؐ کو خدا سے برتر قرار دینے میں بھی مسلمانوں کو کوئی باک نہیں ہے۔ عام مسلمان اس کو کسی قدر مخفی الفاظ میں کہتے ہیں۔ اور جو لوگ زیادہ بے باک ہیں وہ سیدھے سیدھے یہ اعلان کر رہے ہیں :

اللہ کے پلہ میں وحدت کے سوا کیا ہے جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے

موجودہ مسلمانوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ خدا کے بارہ میں خواہ کتنی ہی زیادہ مخالفانہ باتیں کہی جائیں، انہیں اس پر کبھی جوش نہیں آتا، اور نہ اس پر ان کے جذبات بھڑکتے۔ لیکن اگر ان کے پیغمبر کے بارہ میں کوئی شخص گستاخی کا ایک کلمہ بول دے تو وہ فوراً بھڑک کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کے قدرت اللہ شہاب صاحب نے مسلمانوں کی اس نفسیات کو دو واقعے کی شکل میں بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ دونوں واقعات ان کی ابتدائی طالب علمی کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کو ہم ان کی کتاب سے یہاں نقل کرتے ہیں :

آبادی سے دور ایک مخبوط الحواس، مجنوں صفت، مجذوب نما شخص ویرانے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اور ہمہ وقت اِلّا اللہ، اِلّا اللہ کی ضربیں لگاتا رہتا تھا۔ میں اور میرا ایک ہم عمر ہندو دوست اکثر اس کے پاس جا کر اس کا منہ چڑایا کرتے اور اس کے ذکر کی نقلیں اتارا کرتے تھے۔ میرا ہندو دوست اِلّا اللہ کے وزن پر مہمل مضحکہ خیز اور کبھی کبھی فحش قافیے جوڑ کر مذاق بھی اڑایا کرتا تھا۔ مجذوب نے ہمیں بار بار ڈانٹا کہ ہم اللہ کے نام کی بے حرمتی نہ کریں لیکن ہم باز نہ آئے۔ ایک روز ہم دونوں اسی مشغلے میں مصروف تھے کہ ایک شخص ادھر سے چند نعتیہ اشعار الاپتا ہوا گزرا، جس کا ایک مصرعہ یہ تھا :

محمدؐ نہ ہوتے تو دنیا نہ ہوتی

یہ مصرع سن کر میرا ہندو دوست زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور اس نے اسم محمدؐ کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر ایک پتھر اٹھایا، اور اسے گھما کر ہندو لڑکے کے منہ پر ایسے زور سے دے مارا کہ اس کا سامنے کا آدھا دانت ٹوٹ گیا۔

لاشعور کی وہ کون سی لہر تھی جو اللہ کے ساتھ مذاق پر تو خاموش رہتی تھی لیکن رسول اللہؐ کے ساتھ گستاخی پر آناً فاناً جوش میں آگئی تھی ؟۔

رسولِ خدا کے متعلق بدزبانی کرے تو اکثر لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ تو مرنے مارنے کی بازی تک لگا بیٹھتے ہیں۔ اس میں اچھے، نیم اچھے یا برے مسلمان کی بالکل کوئی تخصیص نہیں۔ بلکہ تجربہ تو یہی شاہد ہے کہ جن لوگوں نے ناموسِ رسولؐ پر اپنی جانِ عزیز کو قربان کر دیا، ظاہری طور پر نہ تو وہ علم و فضل میں نمایاں تھے اور نہ زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ ایک عامی مسلمان کا شعور اور لاشعور جس شدت اور دیوانگی کے ساتھ شانِ رسالت کے حق میں مضطرب ہوتا ہے، اس کی بنیاد عقیدے سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے۔ خواص میں یہ عقیدت ایک جذبہ اور عوام میں ایک جنون کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔" شہاب نامہ، از قدرت اللہ شہاب، لاہور ۱۹۸۸، صفحہ ۱۷۔ ۱۲۱۶

خدا کے بارہ میں غیر حساس ہونا اور خدا کے پیغمبر کے بارہ میں حساس ہونا بلاشبہ گمراہی ہے۔ اس کا ہدایت سے کوئی تعلق نہیں۔ جو لوگ اس قسم کی خوش عقیدگی میں جی رہے ہیں، وہ قیامت کا انتظار کریں۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ایک نیا دین تھا جو انھوں نے خود اپنی طرف سے گھڑ رکھا تھا، خدا کے بھیجے ہوئے دین سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اصل یہ ہے کہ ایک اسلام کا دین ہے، اور دوسرا ہیرو پرستی کا دین۔ آدمی اگر صحیح معنوں میں اسلام کے دین پر ہو تو اس کے اندر خدا اور رسول دونوں کے ساتھ یکساں درجہ میں تعلق ابھرے گا۔ وہ خدا پر ایمان سے بھی سرشار ہوگا اور رسولؐ پر ایمان سے بھی۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا دین اسلام نہیں ہے بلکہ ہیرو پرستی ہے۔ انھوں نے خدا کو اپنا خدا نہیں بنایا۔ البتہ پیغمبر کو انھوں نے اپنا ہیرو بنا لیا ہے۔ پیغمبر ان کا قومی ہیرو ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں خدا کا رسول۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی توہین کی جائے تو وہ غیر جانبدار بنے رہتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص رسول کے بارہ میں توہین کا کلمہ بولے تو فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔

مسلمان اپنے اس خود ساختہ دین پر خوش ہیں۔ مگر انہیں جاننا چاہیے کہ قرآن نے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان فرق کرنے والوں کے لیے عذاب کا اعلان کیا ہے نہ کہ انعام کا اعلان (النساء ۱۵۰)

جلوس کی سیاست

سلمان رشدی کے مسئلہ کو لے کر ہندستان کے مختلف مقامات مثلاً سرینگر، بمبئی (فروری ۱۹۸۹)

وغیرہ میں مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف جلوس نکالا۔

ہر جگہ یہ قصہ پیش آیا کہ جلوس میں شرکت کرنے والے مسلمان کسی ایک یا دوسرے سبب سے مشتعل ہوکر تشدد پر اُتر آئے۔ انھوں نے قانون کی خلاف ورزی کی۔ حتیٰ کہ پولس کے اوپر پتھراؤ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے گولیاں چلائیں جس میں مسلمانوں کی نہایت قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔

اس قسم کا اقدام ناقابل فہم حد تک لغو تھا۔ کیونکہ ہندستان وہ ملک ہے جس نے اس کتاب پر سب سے پہلے قانونی پابندی لگائی۔ حتیٰ کہ پاکستان اور ایران سے بھی پہلے۔ پھر جب یہاں عملاً اس قابل اعتراض کتاب پر پابندی لگ چکی ہے، ایسی حالت میں ہندستان میں کتاب کے خلاف جلوس نکالنے کی معقولیت کیا ہے۔

جلوس نکالنے والے لیڈر بظاہر معصوم بن کر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا جلوس ہندستان کے خلاف نہیں بلکہ برطانیہ کے خلاف تھا۔ ہم برطانی سفارت خانہ یا برٹش کونسل کے دفتر تک جاکر وہاں اپنا تحریری احتجاج نامہ دینا چاہتے تھے۔

یہ عذر لیڈروں کے جرم میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات تدبر سے بالکل خالی ہیں اس کے باوجود وہ لیڈری کے میدان میں دھوم مچانا چاہتے ہیں۔ جلوس کے سلسلے میں بار بار کا یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ انسانی ہجوم کی صورت میں سڑکوں پر آتے ہیں وہ اس وقت بالکل غیر معتدل حالت میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی طاقت کا احمقانہ حد تک غلط اندازہ کرتے ہیں۔

اس بنا پر جو لوگ اس وقت انسانوں کے متحرک ہجوم میں ہوتے ہیں، وہ کم از کم اس وقتی نفسیات کی بنا پر، اپنے آپ کو "سڑک کا بادشاہ" سمجھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ معمولی واقعہ پیش آنے پر بھی مشتعل ہوجاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس مصنوعی زعم کے تحت پولس سے لڑجاتے ہیں کیونکہ وہ بظاہر ان کو اپنی تعداد کے مقابلہ میں کم تعداد میں دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلوس ہمیشہ تشدد اور خون خرابہ پر ختم ہوتا ہے۔

اس بنا پر سلمان رشدی کے مسئلہ پر جلوس نکالنا سراسر غلط تھا۔ اگر کچھ لوگ چاہتے تھے کہ وہ اپنا احتجاج برطانی گورنمنٹ تک پہنچائیں تو وہ اس کو بذریعہ ڈاک یا بذریعہ تار بھیج سکتے تھے۔ اور اگر دستی طور پر دینا ضروری ہو تو چند آدمیوں کا وفد کسی برطانی دفتر میں جاکر اسے

ان کے حوالے کر سکتا تھا۔

چند تبصرے

سعودی عرب کے شاہ فہد بن عبد العزیز نے (سلمان رشدی کا نام لیے بغیر) اس پر تبصرہ کیا۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ دعوت الی اللہ کا کام احسن طریقہ سے کرنا چاہیے۔ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم دنیا کی دوسری قوموں کو یہ یقین دلائیں کہ اسلام محبت اور امن کا مذہب ہے۔ اسلام تشدد اور دہشت گردی کا مذہب نہیں (اکد خادم الحرمین الشریفین علی اهمیة الدعوة الی اللہ بالحسنیٰ۔ وان علینا ان نوکد للشعوب الاخری ان الاسلام هو دین المحبة والسلام ولیس دین العنف والارهاب، اخبار العالم الاسلامی، مکہ، ۲۲ مئی ۱۹۸۹)

امیر کویت الشیخ جابر الاحمد الصباح نے کہا کہ ایک سلمان رشدی کیا، دنیا بھر کے ایسے سارے لوگ بھی اپنی اسلام دشمن تحریروں سے اللہ کے اس سچے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

یہی بات الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر سوشیل کمار سریواستو نے ان لفظوں میں کہی کہ "اسلام اتنا کمزور مذہب نہیں شیطانی آیات جیسی ان گنت کتابیں بھی اس کو ہلا نہیں سکتیں۔" (اخبار نو، ۱۷-۲۳ مارچ ۱۹۸۹)

اسلام کی ہزار سال سے زیادہ لمبی شاندار تاریخ ہے۔ اس تاریخ نے اسلام کو اس سے زیادہ مستحکم بنا دیا ہے کہ کوئی شخص یا کوئی بڑے سے بڑا گروہ اپنی باتوں سے اس کو ادنی نقصان بھی پہنچا سکے۔ چنانچہ یہی بات برطانیہ کی موجودہ خاتون وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر نے ان لفظوں میں کہی:

Great religions should be strong enough to withstand such criticisms as were contained in the book.

یعنی عظیم مذاہب کو اتنا زیادہ طاقتور ہونا چاہیے کہ وہ اس قسم کی تنقید کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکیں جو کہ رشدی کی کتاب میں پائی جاتی ہے (دی گارجین، لندن، ۴ مارچ ۱۹۸۹)

پاکستان کی خاتون وزیر اعظم نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس معاملہ کو طول دینے سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ توہین عقیدہ کو دہرانا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا بجائے خود توہین کرنا۔

انھوں نے کہا کہ اس بات کے مدّنظر میرے خیال سے بنیاد پرست مذہبی لوگ بھی رشدی کے ناول اور اس کے قابلِ اعتراض موضوعات کی تشہیر کر کے اسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب رشدی نے کیا ہے۔

دونوں یکساں

مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸ـ ۱۸۳۹) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (۱۹۴۸ـ ۱۸۶۸) دونوں ہم عصر تھے۔ اس زمانہ میں جن علماء نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تحریری اور تقریری مقابلہ کیا، ان میں ایک مشہور نام مولانا ثناء اللہ امرتسری کا بھی ہے۔

تردید قادیانیت پر مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ ان کے مناظروں اور ان کی تحریروں اور تقریروں سے خود مرزا غلام احمد قادیانی تنگ آ گیا۔ اس نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ کو ایک تحریر لکھی۔ اس کا عنوان تھا "مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ"۔ اس تحریر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے لکھا کہ: "مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت بدنام کیا۔ میرے قلعہ کو گرانا چاہا۔ اس لیے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے، وہ سچے کی زندگی میں مر جائے"۔

اس تحریر کے ایک سال بعد ۲۶ مئی ۱۹۰۸ کو مرزا غلام احمد قادیانی کا انتقال ہو گیا۔ دوسری طرف مولانا ثناء اللہ امرتسری مزید ۴۰ سال تک زندہ رہے اور ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ کو سرگودھا (پاکستان) میں وفات پائی۔ اس طرح فیصلۂ خداوندی کے تحت ثابت ہو گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ جھوٹا تھا، اور مولانا ثناء اللہ امرتسری اس کے مقابلہ میں سچ پر کھڑے ہوئے تھے۔

یہ واقعہ مجھے ۳ جون ۱۹۸۹ کو یاد آیا جب کہ ریڈیو نے اطلاع دی کہ ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی کا ۸۶ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ آیات اللہ خمینی نے ۱۵ فروری ۱۹۸۹ کو فرمان جاری کیا تھا کہ سلمان رشدی کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے فوراً ہی بعد حکومت ایران نے اپنے خزانے اور اپنے سرکاری ذرائع اس فرمان (یا فتویٰ) کی تعمیل کے لیے وقف کر دیے۔ اس کے بعد دنیا بھر میں خمینی اور رشدی کا معاملہ سب سے زیادہ سنسنی خیز خبر کی حیثیت سے اخباروں میں چھپتا رہا۔ حکومت ایران نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ ایک خفیہ دستۂ موت (Death squad) اس قاتلانہ مشن پر روانہ کیا جا چکا ہے۔

مگر حکومت ایران کے مکمل تعاون اور دنیا بھر میں بے شمار شیعہ اور سنّی مسلمانوں کی بھرپور تائید کے باوجود آیات اللہ خمینی اس میں کامیاب نہ ہو سکے کہ وہ سلمان رشدی کو قتل کرا دیں۔ یہاں تک کہ اپنے فرمان موت کے تقریباً چار مہینہ بعد خود آیت اللہ خمینی موت کا شکار ہو گئے۔

مذکورہ دونوں واقعات میں بعض فرق کے ساتھ ایک مشابہت ہے۔ اول الذکر واقعہ میں یہ ثابت ہوا تھا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری حق پر ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی باطل پر۔ ثانی الذکر واقعہ میں کسی قدر فرق کے ساتھ یہ ثابت ہوا ہے کہ اس کے دونوں ہی فریق باطل پر ہیں۔ سلمان رشدی بھی، اور اسی کے ساتھ آیات اللہ خمینی بھی۔

سلمان رشدی کو تاریخی حقائق باطل ثابت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف آیت اللہ خمینی اس لیے باطل قرار پاتے ہیں کہ انھوں نے جھوٹے زعم کے تحت ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کا انہیں خدا نے حق نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں خدا کی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ وہ اپنی ساری مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور عوامی طاقت کے باوجود سلمان رشدی کو ختم کرنے میں ناکام رہے۔ قتل تو درکنار، اقدام قتل کے درجہ کا بھی کوئی واقعہ وہ ظہور میں نہ لا سکے۔ یہاں تک کہ موت نے خود ان کا خاتمہ کر دیا۔

ناقابل فہم

مسلمانوں میں سے جو لوگ سلمان رشدی کے قتل کی وکالت کر رہے ہیں وہ شتم رسول کے مسئلہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا کہ یہ کوئی عام اور مطلق حکم ہے۔ یعنی یہ کہ جب بھی کوئی شخص رسول پر سب وشتم کرے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ از روئے مسئلہ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص نہیں۔ اسی طرح اس کا تعلق کسی ایک پیغمبر سے بھی نہیں ہے بلکہ تمام پیغمبروں سے ہے۔ قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے ان میں سے کسی ایک پیغمبر پر سب وشتم کرنا فوراً آدمی کو گردن زدنی قرار دے دیتا ہے۔

اگر شتم کے اس مسئلہ کو صحیح مان لیا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صدیوں سے تمام علماء اور تمام مسلم حکمراں اس معاملہ میں مجرمانہ غلطی کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ بار بار سب وشتم کا واقعہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس مسئلہ پر عمل نہیں کیا۔ نہ علماء نے قتل کے فتوے دیے، اور نہ حکمرانوں نے ایسے لوگوں کو قتل کرایا۔

جن علماء اور فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ ہے کہ سب وشتم کرنے والا شخص واجب القتل ہے، وہ ان کے نزدیک صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں ہے بلکہ خدا کے تمام پیغمبروں کے لیے ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب میں ایک مستقل باب اس عنوان کے تحت قائم کیا ہے کہ:

فصل فی ان حکم سب سائر الانبیاء حکم سب نبینا علیہ السلام۔

اس باب کے تحت ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ تمام پیغمبروں کو سب وشتم کرنے کا وہی حکم ہے جو ہمارے پیغمبر کو سب وشتم کرنے کا حکم ہے۔ پیغمبروں میں سے جس پیغمبر کو بھی کوئی شخص سب و شتم کرے وہ کافر ہے اور اس کا خون حلال ہے (والحکم فی سب سائر الانبیاء کالحکم فی سب نبینا..... انّ سابھم کافر حلال الدم، صفحہ ۵۷۱ — ۵۷۰)

ایک طرف اس مسئلہ کو سامنے رکھئے۔ دوسری طرف یہ دیکھئے کہ فقہاء کے یہاں سب وشتم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کسی نبی کی اشارہ سے بھی تحقیر کرنا شتم میں داخل ہے۔ ایک مثال اس کو واضح کرتی ہے۔ امام ابو یوسف نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے

میں کدو کو پسند کرتے تھے اور اس کو رغبت سے کھاتے تھے۔ اس پر جماعت میں سے ایک شخص اٹھا اور اونچی آواز سے کہنے لگا کہ مجھے تو کدو پسند نہیں۔ امام ابو یوسف نے اس کے اس کلام کو شتم قرار دیا اور اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ آخر کار اس شخص نے توبہ کی اور (حنفی مسلک کے مطابق) اس کی معافی ہوئی۔

اسی واقعہ پر علامہ انور شاہ کشمیری نے یہ شعر کہا ہے کہ ابو یوسف نے ایک شخص کو یہ کہنے پر قتل کر دیے جانے کا حکم دے دیا کہ مجھے کدو پسند نہیں، اور وہ وقت معافی کا نہ تھا:

وَقِصَّةُ دُبَّاءٍ رأى القتلَ عِندَها ابُو يوسُفَ القاضي ولاتَ أوانِ

اب اگر مسئلہ وہی ہو جو بظاہر اوپر کے بیان میں نظر آتا ہے تو علماء اسلام کو چاہیے تھا کہ ایسے تمام شاتمین کے بارہ میں قتل کا فتویٰ دیں۔ اور پھر عام مسلمانوں سے یا مسلم حکومتوں سے یہ کہیں کہ وہ انھیں فوراً قتل کر دیں۔ مگر حال یا ماضی کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا۔

ایک مثال لیجئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے بتکرار حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں واضح گستاخیاں کی ہیں۔ مثلاً اس کا ایک شعر یہ ہے:

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے

مرزا غلام احمد قادیانی کے اسی قسم کے سب وشتم کی بنا پر اس کے بارہ میں علامہ انور شاہ کشمیری نے یہ شعر کہا ہے کہ (غلام احمد قادیانی کے ہاتھوں) ایک اولو العزم پیغمبر کو تمہارے سامنے گالی دی جا رہی ہے۔ یہ ایسا جرم ہے کہ قریب ہے کہ آسمان اور زمین پھٹ پڑیں:

يُسَبُّ رسولٌ من أُولي العزم فيكُمُ تكادُ السماوات الأرضُ تَنفَطِرانِ

رسول پر اس سب وشتم کے باوجود مولانا کشمیری نے اور نہ دوسرے علماء نے یہ کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو قتل کر دو۔ قادیانی اپنے کھلے ہوئے سب وشتم کے باوجود زندہ رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت سے مر کر خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

یہ صرف مرزا غلام احمد قادیانی کی بات نہیں بلکہ دنیا میں بسنے والے بیشتر انسانوں کی بات ہے۔ جب سب وشتم کے جرم کا تعلق یکساں طور پر تمام پیغمبروں سے ہے اور اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اشارہ اور کنایہ کے درجہ میں بھی اگر کسی کے کلام سے کسی پیغمبر کی تحقیر ظاہر ہو تو وہ شاتم رسول قرار پاتا ہے

اور قانون کی نظر میں واجب القتل ہو جاتا ہے تو نہ صرف معروف قسم کے بد دین شتم رسول کے مجرم قرار پائیں گے بلکہ کتنے ہی صلحاء اور علماء کو بھی اس صف میں کھڑا کرنا پڑے گا۔

مثال کے طور پر علامہ اقبال کی ایک نظم نظام الدین اولیاء کے بارہ میں ہے۔ اس کا عنوان "التجائے مسافر" ہے۔ اس نظم کے دو مصرعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ اس میں پیغمبر کے اوپر غیر پیغمبر کو بلند مرتبہ بتایا گیا ہے جو ہر تعریف کے مطابق شتم رسول ہے :

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

اسی طرح مشہور دیوبندی عالم مولانا محمود حسن صاحب کو بھی خدانخواستہ انہیں شاتمین کی صف میں شمار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کے فرمودات میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کی تحقیر کو مستلزم ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر :

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا اس مسیحائی کو دیکھیں ذرا ابن مریم

یہودی بحیثیت قوم حضرت مسیح کو نعوذ باللہ ولد الزنا کہتے ہیں، اس لیے وہ سب کے سب واجب القتل ہیں۔ عیسائی بحیثیت قوم پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بناوٹی پیغمبر (False prophet) کہتے ہیں، اس لیے وہ بھی سب کے سب واجب القتل ہوئے۔ آج کل کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، وحی کو کوئی حقیقی چیز نہیں سمجھتا۔ اس کا عام خیال یہ ہے کہ پیغمبروں نے لوگوں کو، نعوذ باللہ، بے وقوف بنانے کے لیے یہ کہہ دیا کہ ان پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے انھوں نے ایسے کلام کو خدا کا کلام بتا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اسی طرح دنیا کی موجودہ آبادی کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی اعتبار سے اس جرم کا مرتکب ہو رہا ہے جس کو شتم رسول کہا جاتا ہے۔ پھر کیا یہ پُرجوش مسلمان ان تمام لوگوں کو ایک طرف سے قتل کریں گے۔ کیا ان کے لیے اس قسم کا قتل عام ممکن ہے۔ اور کیا اس نوعیت کا قتل عام نہ کرنے کی صورت میں وہ خدا کے یہاں ناقابل معافی مجرم نہ قرار پائیں گے۔

ابن تیمیہ کی کتاب

علامہ ابن تیمیہ کی کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول کا وہ نسخہ میرے پاس ہے جو مجلس دائرۃ المعارف (حیدر آباد) سے ۱۳۲۲ھ میں چھپا تھا۔ اس کے ۶۰۰ صفحات ہیں۔ اس کتاب میں شتم رسول کے مسئلہ پر نہایت تفصیلی بحث ہے۔ اس موضوع پر اسلامی کتب خانہ کی غالباً یہ سب سے زیادہ جامع کتاب ہے۔

ابن تیمیہ کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ ان کا ذہن گویا ایک زندہ قاموس تھا۔ امام ذہبی نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ کوئی حدیث جس کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں وہ حدیث ہی نہیں (کل حدیث لا یعرفہ ابن تیمیۃ فھو لیس بحدیث) حافظہ کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی کتابیں معلومات کا خزانہ ہوتی ہیں۔ مگر راقم الحروف کا احساس ہے کہ ان کی کتابیں معلومات کے اعتبار سے جس معیار کی ہوتی ہیں، وہ تجزیہ اور استدلال کے اعتبار سے اسی اعلیٰ معیار کی نہیں ہوتیں۔

اس کا ایک نمونہ ابن تیمیہ کی موجودہ کتاب بھی ہے۔ بلاشبہ زیر بحث موضوع پر معلومات کے اعتبار سے ان کی یہ کتاب منفرد کہی جا سکتی ہے۔ مگر تجزیہ اور استدلال کے اعتبار سے وہ کوئی معیاری کتاب نہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں نے اس کے نوٹ تیار کر لیے ہیں جو کئی صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کی روشنی میں آئندہ انشاء اللہ کسی وقت اس کتاب پر ایک مستقل مضمون لکھوں گا جس میں اس کے مباحث کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے گا۔ یہاں مختصر طور پر صرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

زیر بحث موضوع پر ابن تیمیہ کا نظریہ یہ ہے کہ شتم رسول کی سزا لازمی طور پر قتل ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ جیسے ہی کوئی شخص سب وشتم کا جرم کرے وہ فوراً اس کو مار کر اس کا خاتمہ کر دیں۔ ایسے شخص کے لیے اسلام میں اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ مگر اس نظریہ کے حق میں انھوں نے جو دلائل جمع کیے ہیں، وہ اس کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔

۱۔ علامہ ابن تیمیہ نے ایک باب کے تحت اس اعرابی مسلمان کا ذکر کیا ہے جس نے حنین کی غنیمت کی تقسیم کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل پر الزام لگایا تھا اور کہا تھا کہ یہ

تقسیم رضائے الٰہی کے مطابق نہیں کی گئی ہے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے اللہ کی پناہ کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ میں اپنے اصحاب کو قتل کرتا ہوں۔

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ کو صرف اس لیے قتل کرنے سے منع فرمایا کہ لوگ یہ چرچا کریں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ آپ نے اس لیے منع نہیں فرمایا کہ بجائے خود وہ شخص معصوم تھا (فان النبی صلے اللہ علیہ وسلم لم یمنع عمر من قتلہ الا لئلا یتحدث الناس ان محمداً یقتل اصحابہ ولم یمنعہ لکونہ فی نفسہ معصوماً، صفحہ ۱۷۴)

ابن تیمیہ کی اس توجیہہ پر غور کیجئے۔ وہ اپنی کتاب میں اس نظریہ کی وکالت کر رہے ہیں کہ رسول کی شان میں گستاخی کرنے والا ہر حال میں مباح الدم ہے، اس کو ضرور قتل کر دیا جائے۔ اب ان کے سامنے زمانۂ رسولؐ کے ایسے واقعات آتے ہیں جب کہ علی الاعلان گستاخی کرنے کے باوجود لوگوں کو قتل نہیں کیا گیا۔

مذکورہ سنّت کے سامنے آنے کے بعد صحیح یہ تھا کہ ابن تیمیہ اپنے نظریہ کی تعدیل کریں، وہ یہ کہیں کہ شاتم رسول کے لئے قتل کی سزا مقید ہے نہ کہ مطلق۔ مگر وہ ایسا نہیں کہتے۔ اس کے برعکس وہ جواب دیتے ہیں کہ ایسے افراد کو قتل نہ کرنے کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ مباح الدم نہ تھے۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اگر ایسے افراد کو قتل کیا جاتا تو لوگ اس واقعہ کو لے کر اسلام کو بدنام کرنا شروع کر دیتے۔ بالفاظ دیگر، میرا نظریہ بدستور صحیح ہے، وہ اس سے غلط ثابت نہیں ہوا۔

مگر سوال یہ ہے کہ ابن تیمیہ کی اس توجیہہ سے ثابت کیا ہوا۔ کیونکہ جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے، وہ بدستور ان کے نظریہ کے خلاف ہے۔ ابن تیمیہ کی مذکورہ توجیہہ اصل صورت واقعہ میں صرف اتنا فرق کرتی ہے کہ پہلے اگر یہ کہا گیا تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو بدنامی سے بچانے کے لیے گستاخ کو قتل نہیں کیا"۔ تو اب ابن تیمیہ کے مطابق، بیان کے الفاظ یہ ہوں گے کہ "گستاخی کرنے والا اگرچہ مباح الدم تھا، اس کے باوجود اسلام کو بدنامی سے بچانے کی خاطر آپ نے اس کو قتل نہیں کیا"۔ دونوں حالتوں میں اصل مسئلہ بدستور یکساں حالت میں

باقی رہتا ہے۔ اور وہ ہے ـــــ گستاخی کرنے والے کو قتل نہ کرنا۔

اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے ایک متوازی مثال لیجیے۔ فتح مکہ کے بعد جو مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے گئے تھے، ان کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے کہ وہ سب کے سب مباح الدم تھے۔ اب اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل آتا ہے کہ آپ نے ان مشرکین کو قتل نہیں کیا بلکہ انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ شخص دوبارہ کہتا ہے کہ مشرکین مکہ کو چھوڑنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ مباح الدم نہ تھے، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ آپ ان کی تالیف قلب کرنا چاہتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اس توجیہہ سے اصل مسئلہ میں کیا فرق پڑا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ سابقہ بات کو کہنے کے لیے الفاظ میں کچھ تبدیلی کر دی جائے۔ پچھلے بیان کے مطابق، اگر الفاظ یہ تھے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ مکہ کو تالیفِ قلب کے لیے چھوڑ دیا"، تو اب بیان کے الفاظ یہ ہو جائیں گے کہ "مشرکین مکہ اگرچہ مباح الدم تھے، اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلب کی خاطر انہیں چھوڑ دیا"۔ دونوں بیانات کا نتیجہ ایک ہے اور وہ یہ کہ ـــــ مشرکین مکہ کو قتل کیے بغیر چھوڑ دیا گیا۔

"محمد اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں" کو ابن تیمیہ نے شاید بالکل لفظی معنوں میں لے لیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ اب دنیا میں نہ "محمد" باقی ہیں اور نہ "اصحابِ محمد"، اس لیے اب اس مصلحتِ شرعی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو چکا۔ اب تو ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ گستاخی کرنے والا مباح الدم ہے۔ اس لیے ہر ایسے شخص کو پکڑ کر فوراً اسے قتل کر دینا ہے۔

مگر یہ ایک طفلانہ بات ہوگی کہ قولِ رسول کا یہ مطلب لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ "محمد اپنے اصحاب کو قتل کرتے ہیں" کا مطلب اپنے اصل معنی کے اعتبار سے یہ ہے کہ "اسلام اپنے ماننے والوں کو قتل کرتا ہے"۔ اب چونکہ بعد کے دور میں اور آج بھی یہ اندیشہ مزید شدت کے ساتھ موجود ہے، اس لیے آج بھی اس سنت رسول پر عمل کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ آج بھی ہمیں یہی کرنا ہے کہ ایک شخص بالفرض اس معاملہ میں خالص قانونی اعتبار سے مباح الدم ثابت ہو جائے تب بھی ہمیں اس مصلحت کی بنا پر اس کے قتل سے باز رہنا ہے کہ اگر اس کو قتل کیا گیا تو لوگوں کو

یہ موقع مل جائے گا کہ اس کو لے کر اسلام کو بدنام کریں اور اسلام کی وحشیانہ تصویر بنا کر خدا کے بندوں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں آنے سے روکنے لگیں۔

۲۔ عبداللہ بن ابی نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدترین گستاخی کی تھی۔ مثلاً اس نے کہا کہ اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔ عزت والے سے اس نے اپنے آپ کو مراد لیا اور ذلت والے سے، نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اسی طرح اس نے کہا کہ جو لوگ رسول اللہ کے ساتھ ہیں ان پر خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں۔

عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس طرح کی اور بھی بہت سی گستاخیاں کیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے آپ سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ہم ایسا کریں تو مدینہ میں بہت سی ناک اس کے لیے کھڑی ہو جائیں گی۔ مزید آپ نے کہا کہ لوگوں کو یہ موقع نہ دو کہ وہ کہنے لگیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ پس اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اس طرح کے کلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچائے تو اس کا قتل کرنا جائز ہو جائے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قتل کی وجہ سے لوگ اسلام سے متنفر ہو جائیں گے (فعلم ان من آذی النبی صلے اللہ علیہ وسلم بمثل ھذا الکلام جاز قتلہ۔ وانما ترک النبی صلے اللہ علیہ وسلم قتلہ لما خیف فی قتلہ من نفور الناس عن الاسلام، صفحہ ۱۷۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ دعوت کی مصلحت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے۔ آپ نے ایک بدترین گستاخ کو صرف اس لیے قتل نہیں کیا کہ اگر اس کو قتل کیا جاتا تو لوگ اسلام سے متنفر ہو جاتے۔

ابن تیمیہ اپنی کتاب میں اس واقعہ کو اور اس کے سبب کو نقل کرتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ابن تیمیہ کے نظریہ کی تردید ہے۔ ابن تیمیہ بطور خود قتل شاتم کو دین کی سب سے زیادہ بڑی قابلِ لحاظ مصلحت قرار دیتے ہیں جب کہ

سنت رسول واضح طور پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک اور مصلحت ہے جو شاتم کو قتل کرنے سے بھی زیادہ اہم اور قابل لحاظ ہے، اور وہ یہ کہ اسلام کو اس سے بچانا کہ لوگ اس سے متنفر ہو جائیں اور اس کی طرف راغب نہ ہو سکیں۔ اگر اس مصلحتِ دعوت کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو تو شاتم کے زندہ رہنے کو گوارہ کر لیا جائے گا، بجائے اس کے کہ اسلام کی بدنامی کو گوارا کیا جائے۔

مذکورہ واقعہ کا نتیجہ ابن تیمیہ کی رائے کے بالکل برعکس ثابت ہو رہا ہے۔ مگر انہوں نے عجیب و غریب تاویل سے اس کو اپنے موافق بنا لیا۔

۳۔ ابن تیمیہ اپنی اس کتاب کے ایک حصہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ اور جہاد بالنفس زبان سے بھی کیا جاتا ہے جس طرح وہ ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ زبان کا جہاد زیادہ قوی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرکین سے جہاد کرو، اپنے ہاتھوں سے اور اپنی زبانوں سے اور اپنے مالوں سے (النسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابت سے کہا کرتے تھے کہ (اپنے اشعار سے) مشرکوں کے مقابلہ میں جہاد کرو۔ مدینہ کی مسجد نبوی میں حسان بن ثابت کے لیے ایک منبر رکھا جاتا تھا۔ وہ اس پر بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اشعار میں آپ کی مدافعت کرتے تھے، اور مشرکین کے ہجو کا جواب دیتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ اے اللہ تو روح القدس سے حسان کی مدد فرما۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان ثابت سے کہا کہ جبریل برابر تمہارے ساتھ ہوتے ہیں جبکہ تم خدا کے رسول کی طرف سے مدافعت کرتے ہو۔ اور آپ نے فرمایا کہ تمہارے اشعار مشرکین کو زیر کرنے کے لیے تیر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

اور مشرکین کی ایک تعداد مسلمانوں کو اذیت دینے والی چیزوں سے صرف اس لیے رکی رہتی تھی کہ ان کو اپنے بارہ میں حسان بن ثابت کی ہجو کا اندیشہ رہتا تھا۔ کعب بن اشرف جب مدینہ سے مکہ گیا تو اس کا حال یہ ہوا کہ جب بھی وہ کسی ایسے گھر میں ٹھہرنا چاہتا جس کی حسان نے اپنے اشعار میں ہجو کی ہو تو وہ کعب بن اشرف کو اپنے یہاں سے نکال دیتا تھا۔ یہاں تک کہ مکہ میں کعب

کو کوئی گھر نہ ملا جو اس کو اپنے یہاں ٹھہرائے ۔ اور حدیث میں ہے کہ سب سے افضل جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے ایک سچی بات کہنا ہے (صفحہ ۲۰۰)

اوپر کی سطریں ابن تیمیہ کی عبارت کا ترجمہ ہیں ۔ ان باتوں کے تذکرہ کے بعد ابن تیمیہ نے اس سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ عجیب و غریب طور پر بالکل غیر منطقی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب مشرکین کے شتم اور ہجو گوئی اور دین خداوندی کے اظہار اور اس کی طرف دعوت دینے کی بابت زبان سے جہاد کرنے کا معاملہ ایسا معاملہ ہے تو معلوم ہوا کہ جس (معاہد) شخص نے دینِ خدا اور رسولِ خدا پر شتم کیا اور اس کا اظہار کیا اور کتاب الٰہی کا ذکر کھلم کھلا برائی کے ساتھ کیا، تو اس نے مسلمانوں سے جہاد کیا اور ان پر زیادتی کی، اور یہ نقض عہد ہے (اس لیے وہ مباح الدم ہے) صفحہ ۲۰۰

ابن تیمیہ کا مطلب یہ ہے کہ لفظی ہجو تیر سے بھی زیادہ سخت ہے ۔ اس لیے اگر کوئی معاہد رسول کے خلاف گستاخی کرے تو اس نے تیر اور تلوار کے حملہ سے بھی زیادہ شدید حملہ کیا۔ اس لیے اس کا عہد ٹوٹ گیا، اور اسی نقض عہد کی بنا پر وہ واجب القتل ہو گیا ۔

ابن تیمیہ کو یہاں یہ کہنا چاہیے تھا کہ "الفاظ" کا حملہ "تلوار" کے حملہ سے بھی زیادہ سخت اور زیادہ کارگر ہوتا ہے ۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ الفاظ کا جواب الفاظ سے دیں ۔ جو لوگ اسلام یا پیغمبر اسلام پر طعن کریں، نظم و نثر میں طاقتور جواب کے ذریعہ ان کے اٹھائے ہوئے فتنہ کو منہدم کر دیا جائے ۔ ہمارا ایسا کرنا سنتِ رسول کے عین مطابق ہوگا ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اسی اصول پر عمل فرمایا۔ اور اپنے زمانہ کے ہم عصر شاتمین کا جواب حسان بن ثابت سے شعر کی زبان میں دلوایا، جو گویا کہ اس زمانہ کی صحافت تھی ۔

مگر ابن تیمیہ اس کے برعکس، عجیب و غریب طور پر اس سے یہ مسئلہ نکال لیتے ہیں کہ جس شخص نے اسلام پر الفاظ کے ذریعہ حملہ کیا، اس نے اسلام پر ایسا حملہ کیا جو تیر اور تلوار سے بھی زیادہ شدید تھا۔ اس لیے اس کی واحد سزا یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے ۔

مذکورہ سنتِ رسول سے کم از کم جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ شتم رسول کی صرف یہی ایک سزا نہیں ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے ۔ اس سے زیادہ سخت اور کارگر سزا یہ ہے کہ اس کے الفاظ کا جواب طاقتور الفاظ سے دیا جائے ۔ اس کے اشعار کو اشعار سے اور اس کی نثر کو نثر سے

کاٹا جائے۔ اس کے سب وشتم کو دلائل کے ذریعہ ہبا ءً منثورا بنا دیا جائے۔

ابن تیمیہ کا مذکورہ انداز کلام بڑا عجیب ہے۔ جس سنتِ رسولؐ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مخالفین اسلام کے الفاظ کا جواب الفاظ میں دینا چاہیے، کیونکہ وہ جواب کا زیادہ موثر طریقہ ہے۔ اسی سنت سے ابن تیمیہ یہ نکال رہے ہیں کہ شاتم کو قتل کر دو کیونکہ اس نے اسلام پر تلوار کے حملہ سے بھی زیادہ بڑا حملہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب الفاظ کا جواب تیر و تلوار سے بھی زیادہ مؤثر ہے تو ہم بھی اپنے دفاع کے لیے اس زیادہ موثر ہتھیار کو کیوں نہ استعمال کریں۔ اس کے بجائے ہم اس ہتھیار کو استعمال کرنے کی طرف کیوں دوڑیں جو نسبتاً کم موثر ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ــــ جو تم پر سخت وار کرے، تم اس پر ہلکا وار کرو۔

۴۔ عبداللہ بن ابی مدینہ کے منافقین کا سردار تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بدترین گستاخیاں کرتا تھا اور آپ کو اذیت پہنچاتا تھا۔ وہ اپنی آخر عمر تک ایذا رسانی کا یہ کام کرتا رہا۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قتل نہیں کرایا۔ یہاں تک کہ ذوالقعدہ ۹ھ میں وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت مر گیا۔

عبداللہ بن ابی کو قتل نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس لیے اس کے قتل سے باز رہے کہ آپ کو اندیشہ تھا کہ اس کو قتل کرنے کے بعد لوگ اسلام سے دور ہو جائیں گے۔ کیونکہ اسلام اس وقت کمزور تھا (وإنما ترك النبي صلى الله عليه وسلم قتله لما خيف في قتله من نفور الناس عن الاسلام لما كان ضعيفاً، صفحہ ۱۷۵)

ابن تیمیہ کے نزدیک عبداللہ بن ابی کے زمانہ میں اسلام ضعیف تھا، اور قتل سے پیدا ہونے والے حالات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس ضعف کی بنا پر اس کھلے ہوئے شاتم رسول کو قتل نہیں کیا گیا۔ مگر ابن تیمیہ کی یہ توجیہہ مضحکہ خیز حد تک بے معنی ہے۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے پہلے سال مدینہ میں اسلام کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہجرت کے آٹھویں سال مکہ فتح ہوا۔ ہجرت کے نویں سال پورے عرب میں اسلام کا غلبہ قائم ہو گیا۔ اس وقت کم از کم ایک لاکھ جاں نثار صحابہ اسلام کی حمایت پر جمع ہو چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر

یہ کہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ الشریف ابھی دنیا میں موجود تھے۔ آپ وہ پیغمبر تھے جن کی بابت قرآن کی گواہی ہے کہ اپنے مخالفین پر غلبہ ان کے لیے مقدر کر دیا گیا۔ اور یہ کہ ان کا مولیٰ اللہ ہے۔ اور جبریل اور صالح اہل ایمان اور تمام فرشتے ان کے مددگار ہیں۔ (التحریم ۴)

اب سوال یہ ہے کہ دورِ اوّل میں، مذکورہ تمام موافق حالات کے باوجود، جب مستہزئین کو قتل کرنا ممکن نہ تھا تو آج وہ کیسے ممکن ہو جائے گا۔ جب پیغمبر خدا کی موجودگی میں اسلام کا حال یہ تھا کہ وہ ضعیف اور کمزور تھا اور اس بنا پر کھلے ہوئے گستاخ اور شاتم کو قتل نہ کیا جا سکا تو بعد کے زمانوں میں تو اسلام یقینی طور پر اس سے بھی زیادہ ضعیف اور کمزور ہوگا۔ ایسی حالت میں تو شاتم رسول کو قتل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ پھر تو اس سزا کو ابدی طور پر منسوخ فرض کر لینا چاہیے۔

کیسا عجیب ہے علامہ ابن تیمیہ کا مذکورہ استدلال۔ اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس قسم کے دلائل کو دلائل سمجھتے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر اس نظریہ کی وکالت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ شاتم رسول کو لازمی طور پر قتل کر دیں۔ خواہ یہ شاتم مسلم ہو یا غیر مسلم، خواہ وہ اسلامی حکومت کے تحت ہو یا غیر اسلامی حکومت کے تحت، خواہ وہ ساتویں صدی عیسوی کا انسان ہو یا بیسویں صدی عیسوی کا انسان۔

شاید موجودہ مسلمان اور ان کے رہنما اپنے آپ کو خدا اور ملائکہ سے بھی زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں۔ شاید ان کا خیال ہے کہ ان کی ذمہ داریاں اس سے بھی زیادہ ہیں جو معلوم طور پر رسول اور اصحاب رسول کی ذمہ داریاں تھیں۔ یہ مسلمان جن کو ان کے نام نہاد رہنماؤں نے "محتسب کائنات" کے منصب بلند پر بٹھا رکھا ہے، ان کے احتساب کا اگلا مرحلہ شاید وہ آسمانی اقدام ہوگا جس کو ان کے محبوب شاعر نے ان شاندار لفظوں میں بیان کیا ہے:

در دست جنون من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ذاتی حق کا معاملہ نہیں

سیرت اور حدیث کے موجودہ ریکارڈ میں بہت سے واقعات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں واضح طور پر آپ کے خلاف سب وشتم کا معاملہ کیا گیا۔ مگر

آپ نے ایسے لوگوں کو معاف کر دیا۔ آپ نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی قانونی کارروائی نہیں کی۔

اس قسم کے واقعات صریح طور پر ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نظریہ کی تردید ہیں۔ یہاں ان لوگوں نے اپنے حق میں ایک جواب تلاش کر لیا ہے۔ ابن تیمیہ اور دوسرے لوگ (مثلاً ابن قیم) نے لکھا ہے کہ شتم رسول کا مسئلہ حرمتِ رسول کا مسئلہ ہے۔ اس طرح وہ سب وشتم کے معاملہ کو حرمت رسول کا معاملہ قرار دے کر اس کو حقوق العباد کے تحت لائے ہیں۔ مگر یہ ان حضرات کی محض ذاتی توجیہہ ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کے حق میں کوئی واضح دلیل موجود نہیں۔ اور جب تک قرآن وحدیث کی واضح دلیل نہ ہو۔ اس کو حقوق العباد، بالفاظ دیگر، ذاتی حق کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ (صفحہ ۲۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام پر حملہ سادہ معنوں میں ان کی ذات پر حملہ نہیں، وہ براہ راست اسلام پر حملہ ہے اس طرح وہ ذاتی حق کے بجائے دفاع کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص اگر کہے کہ پیغمبر اسلام عادل نہیں تھے تو یہ آپ کے اوپر محض ایک شخصی حملہ نہیں ہوا۔ ایسا حملہ پورے قرآن اور پورے اسلام کو مشتبہ قرار دینے کے ہم معنی ہے۔ ایسی حالت میں وہ اس طرح ختم نہیں ہوسکتا کہ پیغمبر ذاتی طور پر اس کو معاف کر دیں۔ وہ معافی کے بعد بھی پوری طرح باقی رہے گا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا طریقہ اس بارے میں یہ تھا کہ وہ ایسے شخص کو فکری اور نظریاتی طور پر قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے، نہ یہ کہ اس کو جسمانی طور پر قتل کر کے یہ سمجھیں کہ اس کا چھیڑا ہوا فتنہ ختم ہوگیا۔

دفاع نہ کہ حد

اس معاملہ میں ابن تیمیہ اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں نے رائے قائم کرنے میں جو غلطی کی ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انھوں نے شتم رسول کے مسئلہ کو صرف حد یا نفاذ حد کا مسئلہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دفاع کا مسئلہ ہے۔ شاتم دراصل اپنی شتم کے ذریعہ اسلام کی صداقت پر ایک قسم کا فکری حملہ کرتا ہے۔ اور جو حملہ فکری نوعیت رکھتا ہو، اس کا توڑ جوابی فکری یلغار ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ تلوار کے ذریعہ شاتم کی گردن کاٹ دینے سے اس کا دفعیہ نہیں ہوتا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ابن تیمیہ نے خود اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ مشرکین جب پیغمبر اسلام پر ہجو کرتے تھے تو حسان بن ثابت الانصاری جوابی ہجو کے ذریعہ آپ کی طرف سے اس کا دفاع کرتے تھے۔ (کان یقول لحسان بن ثابت اغزھم وغازھم وکان ینصب لہ منبر فی المسجد ینافح عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بشعرہ وھجائہ للمشرکین۔ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللھم ایدہ بروح القدس۔ وقال ان جبرئیل معک ما دمت تنافح عن رسول اللہ وقال ھی اشکٰی فیھم من النبل)

مذکورہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ سب وشتم کا معاملہ اسلام پر ایک نظریاتی حملہ کا معاملہ ہے۔ اس کا صحیح اور کارگر توڑ یہی ہے کہ جوابی نظریہ سے اس کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے منافحت یا مدافعت کا مسئلہ ہے نہ کہ عام معنوں میں سزائے شرعی کے نفاذ کا مسئلہ۔

یہ حقیقت ہے کہ طعنِ اسلام اور شتمِ رسول عام معنوں میں ایک قانونی جرم کا معاملہ نہیں ہے کہ مجرم کو ہلاک کر دینے سے اس کا ازالہ ہو جائے۔ شتمِ رسول، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اسلام پر ایک فکری اور نظریاتی وار ہے۔ اور ایک نظریاتی وار کو جوابی نظریاتی وار کے ذریعہ ہی رد کیا جا سکتا ہے۔

فکری اور نظریاتی فتنہ کو اس طرح ختم نہیں کیا جا سکتا کہ بندوق ہاتھ میں لی جائے اور متعلقہ شخص کو گولی مار کر اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ قاتل کو قتل کر کے قتل کا ازالہ ہو جاتا ہے مگر شاتم کے قتل سے شتم کا ازالہ نہیں ہوتا۔

شتم ایک ایسا مسئلہ ہے جو شاتم کے قتل کے بعد بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ اور جب اصل مسئلہ بدستور باقی رہے تو ایک شخص کو قتل کر دینے سے کیا حاصل۔

قیاسی مسئلہ

عام طور پر مشہور ہے کہ اسلامی شریعت نے رسول پر شتم کرنے والے کے لیے قتل کی سزا بطور حد مقرر کی ہے۔ یعنی یہ ایسی سزا ہے جو لازماً جاری کی جائے گی، وہ توبہ سے بھی ساقط نہیں ہوتی۔ مگر یہ مسئلہ جتنا مشہور ہے، اتنا ہی وہ بے اصل اور غیر ثابت شدہ بھی ہے۔ اگلے صفحات میں ہم قرآن، حدیث اور فقہ تینوں اعتبار سے اس مسئلہ کا جائزہ لیں گے۔

اس موضوع پر غالباً سب سے زیادہ جامع کتاب علامہ ابن تیمیہ (۷۲۸ - ۶۶۱ھ) کی ہے۔ ان کی زندگی میں شتم کا ایک واقعہ ہوا۔ عساف نصرانی نے ایک بار پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے۔ اس کے بعد شام و مصر میں یہ بحث چل پڑی کہ جو شخص رسول پر سب و شتم کرے، اس کی سزا اسلامی شریعت میں کیا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر ابن تیمیہ نے ایک ضخیم کتاب لکھی جو بعد کو الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول کے نام سے شائع ہوئی۔ یعنی رسول کو گالی دینے والے کے اوپر کھلی تلوار ــــــ راقم الحروف کے پاس اس کا جو نسخہ ہے وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

قرآن سے استدلال

ابن تیمیہ اپنی اس کتاب (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول) کی ایک فصل میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک ایسی آیتوں کا تعلق ہے جو شاتم کے کفر اور اس کے قتل پر دلالت کرتی ہوں تو ایسی آیتیں قرآن میں بہت ہیں (واما الآیات الدالات علیٰ کفر الشاتم وقتلہ ..... فکثیرۃ، صفحہ ۲۸)

مگر اس کے بعد اس کے ثبوت میں انھوں نے جو آیتیں نقل کی ہیں، ان کا قتل شاتم کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی پیش کی ہوئی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو پیغمبر کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے۔ کہو کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے کان ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے۔ اور وہ رحمت ہے ان کے لیے جو تم میں اہل ایمان ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالانکہ اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ حقدار ہیں کہ وہ اس کو راضی کریں، اگر وہ مومن ہیں۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ جو اللہ اور

اس کے رسول کی مخالفت کرے، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے (التوبہ ۶۱ ـ ۶۳)

ان آیتوں میں ایسے لوگوں کا ذکر تو یقیناً ہے جنھوں نے پیغمبر کو اذیت پہنچائی تھی۔ مگر ان میں صراحتہً یا اشارۃً کسی بھی انداز میں یہ حکم موجود نہیں کہ ایسے لوگوں کو قتل کر دو۔ ان آیتوں میں صرف جہنم کی آگ اور آخرت کے رسوا کن عذاب کا ذکر ہے، گویا یہ آیتیں مسلمانوں سے کہہ رہی ہیں کہ تم ان "شاتمین" سے اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ ان کا جو جرم ہے، اس کی سزا انھیں قیامت میں دی جائے گی۔ تمہارا کام دعوت دینا ہے اور اللہ کا کام محاسبہ کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیتوں سے قتل شاتم کا مسئلہ نکالنا لغت اور تفسیر کے علم سے کشتی لڑنے کے ہم معنی ہے۔

دوسری آیت جو ابن تیمیہ نے قتل شاتم کے ثبوت میں پیش کی ہے، اس میں صرف یہ ہے کہ تم مخالفین رسول سے دوستی نہ رکھو۔ اس کے علاوہ سزائے قتل کا اس میں بھی مطلق کوئی ذکر نہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے :

تم ایسی قوم نہ پاؤ گے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اور وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے۔ اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے۔ اور وہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے (المجادلہ ۲۲)

اس دوسری آیت کے تحت ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ابو قحافہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شتم کیا تو ابو بکر صدیق ؓ نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ یا یہ کہ ابن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کی تو اس کے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے قتل کی اجازت مانگی۔ اس لیے ثابت ہو گیا کہ رسول سے مخالفت کرنے والا کافر اور قابلِ قتل ہے (وقد قیل ان من سبب نزولھا ان ابا قحافۃ شتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاراد الصدیق قتلہ۔ او ان ابن اُبی تنقص النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاستأذن ابنہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی

قتله لذلك فثبت ان المحادّ كافر حلال الدم، صفحہ ۲۹)

ابن تیمیہ کے یہ الفاظ دلیل نہیں ہیں بلکہ دھاندلی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ دونوں واقعہ میں ابوبکر صدیق اور ابن اُبی کے بیٹے (عبد اللہ) کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ اے خدا کے رسولؐ، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کو قتل کر دوں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس واقعہ کا اگلا حصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں سے کسی کے بھی قتل کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ دونوں "شاتم" زندہ رہے اور اپنی طبعی موت مرے۔

ظاہر ہے کہ ان واقعات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے شریعت کا حکم اخذ کیا جائے گا نہ کہ دو مسلمانوں کے ان الفاظ سے جو ہنگامی حالت میں ان کی زبان سے نکل پڑے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق نہیں فرمائی۔

موجودہ زمانہ میں سلمان رشدی کا کیس سامنے آنے کے بعد جو لوگ اس کے قتل کی وکالت کر رہے ہیں، انھوں نے بھی اس سلسلہ میں کثرت سے مضامین اور بیانات شائع کیے ہیں۔ ان مضامین میں بھی یہ دعوی کیا گیا ہے کہ شاتم کو قتل کرنے کا مسئلہ قرآن سے ثابت ہے۔ مگر ان سب کی دلیلیں بھی اسی طرح بے اصل ہیں جس طرح ابن تیمیہ کی دلیل بالکل بے اصل ہے۔

مثال کے طور پر پاکستان کے ایک عالم مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رشدی کے خلاف ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "رشدی جیسے ملعون کا واجب القتل ہونا کئی آیات سے ثابت ہے" (ماہنامہ حق چار یار، لاہور، جون ۱۹۸۹) اس کے بعد انھوں نے قرآن کی ایک آیت پیش کی ہے، اس آیت کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

بے شک جو لوگ اللہ کو اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اذیت دیتے ہیں، بغیر اس کے کہ انھوں نے کچھ کیا ہو، تو انھوں نے بہتان کا اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا (الاحزاب ۵۷ - ۵۸)

اس آیت میں رسول کو ایذا پہنچانے کا ذکر تو ضرور ہے۔ مگر اس میں یہ حکم قطعاً موجود نہیں کہ ایذا پہنچانے والے شخص کو قتل کر دو۔ اس آیت میں صرف خدا کی لعنت اور خدا کے عذاب کا ذکر ہے۔

دنیا میں قانونی سزا کے ذکر سے یہ آیت بالکل خالی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحب مضمون نے قرآن سے لفظ "ایذا" لیا اور "قتل" کا لفظ اس میں اپنی طرف سے جوڑ دیا۔ اگر اس طرح سے بھی کوئی بات ثابت ہوتی ہو تو کون سی بات ہے جو قرآن سے ثابت نہ کی جا سکے۔

جس شخص نے بھی قتل شاتم کے مسئلہ کو قرآن سے ثابت کرنا چاہا ہے، اس نے اسی قسم کا انداز اختیار کیا ہے جس کی دو مثالیں اوپر نقل کی گئیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود ہی نہیں جس میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ شاتم کو قتل کر دو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تر ایک خود ساختہ مسئلہ ہے۔ اس کا خدا کی کتاب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔

حدیث سے استدلال

پورے ذخیرۂ حدیث میں کوئی معتبر روایت ایسی موجود نہیں جس کے عبارت النص میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ سب وشتم کرنے والے کو قتل کر دو۔ مثلاً اس کے الفاظ یہ ہوں کہ مَن سبّ رسولکم فاقتلوہ یا مَن شتم نبیا من الانبیاء فیقتل حدا۔ حدیث سے یہ حکم بطریق قیاس نکالا گیا ہے نہ کہ بطریق نص۔

اس معاملہ میں سب سے عام استدلال یہ ہے کہ حدیث میں یہ حکم آیا ہے کہ جو شخص اپنے دین کو بدل ڈالے اس کو قتل کر دو (مَن بدّل دینہ فاقتلوہ) کہا جاتا ہے کہ چونکہ رسول کا سب وشتم ارتداد کے ہم معنی ہے، اس لیے ایسا فعل کرنے والا مرتد ہو گیا۔ اور جب وہ مرتد قرار پا گیا تو حدیث کے مطابق وہ اس کا مستحق ہو گیا کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ یہ استدلال کی وہی قسم ہے جس کے ذریعہ شاعر نے شہد کی مکھی کے "قتل" کا جواز نکالا تھا:

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

حقیقت یہ ہے کہ ارتداد اور شتم کو ہم معنی قرار دینا بذاتِ خود ایک غلط قیاس ہے۔ ارتداد ایک شخصی فعل ہے جس طرح قاتل کا قتل کرنا ایک شخصی فعل ہے۔ مرتد صرف یہ کرتا ہے کہ اپنی ذات کو دین سے الگ کر لیتا ہے۔ مگر شتم ایک متعدی فعل ہے۔ کیونکہ شاتم اپنے شتم کے ذریعہ دوسروں پر اثر ڈالتا ہے۔ وہ دوسروں کے اندر دین کے بارہ میں شک ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شتم اعتراض اور تنقید اور نکتہ چینی کی نوعیت کا فعل ہے۔ مرتد کو ذاتی سزا دے کر

اس کا مسئلہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ مگر شتم کے اثرات کو اس وقت تک ختم کرنا ممکن نہیں جب تک اس کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دلیل کے ذریعہ رد نہ کر دیا جائے۔

اس کی ایک مثال لیجئے۔ یہ مثال وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۸ (الکوثر) کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔

عربی زبان میں ابتر کے معنی ہیں کٹا ہوا۔ عربی میں اس شخص کو ابتر کہا جاتا ہے جو بے اولاد ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چونکہ اولاد نرینہ نہ تھی، اس لیے مکہ کے لوگ آپؐ کو ابتر کہتے تھے۔ یعنی ایسا شخص جس کی نسل آئندہ باقی نہ رہے۔ العاص بن وائل قدیم مکہ کا ایک مشرک سردار تھا۔ اس کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا کہ انھیں چھوڑو، وہ تو ایک ابتر شخص ہیں ان کے بعد ان کا کوئی وارث نہیں۔ جب وہ ختم ہوں گے تو ان کا ذکر بھی ختم ہو جائے گا (دعوہ فانہ رجل ابتر لا عقب لہ فاذا ھلك انقطع ذکرہ، تفسیر ابن کثیر ۴/۵۵۹)

یہ واضح طور پر شتم رسول کا ایک واقعہ تھا۔ اس سے عام انسان اس غلط فہمی میں پڑ رہے تھے کہ واقعی پیغمبر اسلام ابتر ہیں، ان کے بعد ان کا سلسلہ باقی رہنے والا نہیں۔ اس غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کچھ لوگ آپ پر ایمان لانے میں متردد ہو رہے تھے۔ اب اس کا جواب یہ نہیں تھا کہ عاص بن وائل اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ طاقتور دلیل سے اس کو رد کر دیا جائے۔

چنانچہ اس کی تردید میں وہ سورہ اتری جس کو الکوثر کہا جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا کہ ہم نے محمد کو کوثر دے دیا ہے۔ محمد ابتر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ ابتر ہیں جو محمد کی مخالفت کر رہے ہیں۔

کوثر کے لفظی معنی خیر کثیر کے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ خیر ہے جو اللہ نے آپ کو دیا (ھو الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ) ابن عباس کے شاگرد عکرمہ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مراد نبوت اور قرآن ہے (ھو النبوۃ والقرآن، صفحہ ۵۵۸) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو اولاد سے زیادہ بڑی چیز دے دی ہے، اور وہ سچا

دین ہے۔ یہ دین لوگوں کو متاثر کرے گا اور کروروں لوگ آپ کے پیرو اور وفادار بن جائیں گے۔ ایک صُلبی وارث کے بجائے آپ کو کروروں نظریاتی وارث حاصل ہوں گے۔ حتیٰ کہ خود مخالفین کی اولادیں اپنے باپ دادا کو چھوڑ کر آپ کا ساتھی بننے پر فخر محسوس کریں گی۔ ایسی حالت میں سمجھ لو کہ ابتر کون ہے، تم یا محمدؐ۔

قرآن کا یہ جواب بلاشبہ قتل جسمانی سے زیادہ سخت تھا۔ قتل جسمانی ایک فرد کو ختم کرتا، مگر اس طاقتور تردید نے فرد کے پورے منصوبہ کو ختم کر دیا۔

مرتد اور شاتم کے فرق کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ عرب کے مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو سب وشتم کرتے تھے، حسّان بن ثابت انصاری اشعار کے ذریعہ اس کا جواب دیتے تھے۔ یہ اشعار ان شاتمین کو تیر سے بھی زیادہ سخت بن کر لگتے تھے۔

اس مقصد کی خاطر حسّان بن ثابت کے لیے مدینہ کی مسجد نبوی میں ایک منبر رکھا جاتا تھا۔ اس پر بیٹھ کر وہ اپنے جوابی اشعار پڑھتے تھے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شاتمین کے مقابلہ میں منافحت (مدافعت) کرتے تھے (الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ۲۰۰)

شتم کرنے والوں کے بارہ میں یہ بات عین صحیح اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ اب اس بات کو مرتدین کے ساتھ جوڑ دیجئے اور الفاظ کو بدل کر اس طرح کہئے کہ ــــــ "جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو چھوڑ کر مرتد ہو گئے تھے، ان کا جواب حسان بن ثابت اشعار کی صورت دیتے تھے۔ اس مقصد کے لیے مسجد نبوی میں ایک خاص منبر رکھا جاتا تھا۔ حسان اس پر بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مرتدین کے مقابلہ میں منافحت (مدافعت) کرتے تھے۔"

پہلی بات انتہائی بامعنی معلوم ہو رہی تھی، مگر دوسری بات اتنی ہی بے معنی معلوم ہونے لگی۔ کیونکہ مرتدین کا مقابلہ تلوار ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ نے کیا۔ مگر سب وشتم کرنے والوں کا مقابلہ یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا جواب زیادہ طاقتور الفاظ سے دیا جائے جیسا کہ حسان بن ثابت انصاری نے کیا اور کامیاب ہوئے۔ اس مثال سے مرتد اور شاتم کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے پہلو ہیں جو حدیث ارتداد سے مذکورہ استنباط کو بے اصل قرار دیتے ہیں۔ مثلاً مذکورہ حدیث کا تعلق ایک مومن کے مسئلہ سے ہے۔ اس میں اس شخص کا حکم بیان کیا گیا ہے جو پہلے ایمان لایا، اس کے بعد اس نے اسلام کو ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس کے برعکس شتم کا تعلق مومن اور کافر دونوں سے ہے۔ فقہاء کا عام طور پر یہ کہنا ہے کہ رسول کی شان میں گستاخی کرنے والا ہر حال میں قتل کر دیا جائے گا، خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ ابن تیمیہ کے الفاظ میں جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم کرے، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، بیشک اس کو قتل کرنا واجب ہے (ان من سب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من مسلم او کافر فانہ یجب قتلہ، ھذا مذھب علیہ عامۃ اھل العلم، صفحہ ۴)

اب ایک ایسی حدیث جس کا تعلق صرف مسلمانوں کے گروہ سے ہو، جس میں مدعی ایمان کا مسئلہ بتایا گیا ہو، اس کو ایک ایسے عمومی حکم کا ماخذ کیوں کر بنایا جا سکتا ہے جس کا تعلق مومن اور کافر دونوں سے ہو، جس کو دونوں گروہوں کے اوپر یکساں طور پر نافذ کرنا مقصود ہو۔

دوسری بات یہ کہ گستاخی اور استہزاء کا فعل صادر ہونے کے موقع پر کیا کیا جائے، اس کے بارے میں ہم کو قیاس اور استنباط سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا واضح جواب قرآن وسنت میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ پھر جس مسئلہ کا شرعی حکم پیشگی طور پر بتا دیا گیا ہو، اس کے بارے میں ہم کو قیاس اور استنباط سے کام لینے کی کیا ضرورت۔

دوسرے مضمون میں ہم نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ قرآن میں استہزاء کرنے والوں کے بارہ میں یہ حکم ہے کہ ان کو مناسب انداز میں جواب دو۔ اگر اس کے باوجود وہ نہ مانیں تو ان سے اعراض اور ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کرو۔ اسی طرح سنت کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ عرب میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجو اور بدگوئی کر رہے تھے، ان کے مقابلہ میں آپ نے منافحت لسانی کا طریقہ اختیار کیا نہ کہ منافحت شمشیری کا۔

یہ نصوص بتاتی ہیں کہ گستاخی کرنے والے کا معاملہ دین کو بدلنے والے کے معاملہ سے مختلف ہے۔ دونوں کو ایک حکم کے تحت لانا درست نہیں۔

ابن تیمیہ نے زمانۂ رسالت کے کچھ واقعات جمع کیے ہیں، جب کہ کسی کو قتل کیا گیا۔ انھوں

نے لکھا ہے کہ یہ سب لوگ سب وشتم کی بنا پر قتل کیے گئے تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔

مثلاً انھوں نے کعب بن الاشرف کے قتل کا ذکر کیا ہے اور دعوی کیا ہے کہ اس کو سب وشتم کی بنا پر قتل کیا گیا (صفحہ ۷۰-۷۳) مگر حقیقت یہ ہے کہ کعب بن الاشرف کو بار بار نقض عہد (غداری) کرنے کی بنا پر قتل کیا گیا۔ کعب بن الاشرف دوسرے تمام مخالفین کی طرح سب وشتم کے الفاظ بولتا تھا۔ مگر اس کے قتل کا سبب اس کا نقض عہد تھا نہ کہ سادہ طور پر صرف سب وشتم۔

اسی طرح ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ابوجہل کو اس کے سب وشتم کی بنا پر دو انصاری نوجوانوں نے قتل کیا (۱۵۹-۱۶۰) مگر یہ سراسر بے دلیل بات ہے۔ ابوجہل میدان جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑائی لڑتا ہوا مارا گیا۔ وہ مشرکوں کی فوج لے کر مدینہ پر چڑھائی کے ارادہ سے نکلا تھا۔ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر بدر کے مقام پر اس کا مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں بہت سے مشرکین مارے گئے۔ انھیں میں سے ایک ابوجہل تھا۔ اس کو قتل بر بنائے شتم کا کیس قرار دینا بالکل بے معنی بات ہے۔

اس طرح ابن تیمیہ نے دور اول کی کچھ مثالیں دے کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو سب وشتم کی بنا پر قتل کرایا۔ مگر یہ سب غیر متعلق واقعات ہیں۔ ان میں سے کوئی قتل بھی مجرد شتم کی بنا پر نہیں کیا گیا۔ ان کے قتل کے اسباب دوسرے تھے۔ مثلاً میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا جانا، نقض عہد (غداری) کی بنا پر قابل قتل قرار پانا۔ وغیرہ۔

فقہ سے استدلال

فقہاء عام طور پر یہ مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص پیغمبر خدا پر شتم کرے یا ان کے بارہ میں گستاخی کے کلمات کہے تو اس کو لازماً قتل کر دیا جائے، خواہ شتم کرنے والا مسلم ہو یا کافر۔ ملاحظہ ہو:

کتاب الام للشافعی، شرح المنہاج، الروضۃ الندیۃ، الروض الباسم للشوکانی، کشاف القناع عن متن الاقناع، فقہ السنۃ لسید سابق، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، التشریع الجنائی الاسلامی (عبد القادر عودہ) وغیرہا۔

علامہ ابن تیمیہ نے اپنی مفصل کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں اسی مسلک کو دلیل و شواہد سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جمہور کا مسلک ہے۔ اور اس پر عام

علمار اسلام کا اجماع ہے (صفحہ ۴۔۵)

جن لوگوں کی نظر فقہ کی کتابوں پر ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کے مسائل میں فقہار زیادہ تر صرف رائے نقل کرتے ہیں، وہ اس کے دلائل بیان نہیں کرتے۔ ان مسائل میں فقہار کا عام طریقہ یہ ہے کہ ابتدارً اگر ایک معروف عالم کسی معاملہ میں ایک فتویٰ دے دے تو بعد کے لوگ کسی مزید تحقیق کے بغیر بس اسی کو نقل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ دعوی کر دیا جاتا ہے کہ اس پر فقہار و علمار کا اجماع ہے۔ حالانکہ یہ زیادہ تر مقلدانہ اتفاق رائے ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً علمی اور شرعی تعریف کے مطابق اجماع۔

اجماع کو متفقہ طور پر چار ادلّہ شرعیہ میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ تاہم قتل شاتم کے بارہ میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس پر علمار امّت کا اجماع ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ جمہور علمار نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ کسی مسئلہ کے بارہ میں مختلف زمانوں کے علمار و فقہار جو رائیں دیتے رہے ہوں، ان میں عمومی یکسانیت پائی جائے۔ اس کو جمہور کا اتفاق رائے کہا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اہل علم کی اکثریت کی رائے۔

دوسری صورت وہ ہے جس کو اجماع کہا جاتا ہے۔ بیضاوی نے منہاج الاصول میں اجماع کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ معاملات میں سے کسی معاملہ میں امت محمدؐ کے اہل حل و عقد کے اتفاق رائے کا نام ہے (ھو اتفاق اھل الحل والعقد من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی امر من الامور)

اجماع کے برحق ہونے پر اسلام کے شورائی حکم سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اس سلسلہ میں قرآن کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے کہ معاملات میں لوگوں سے مشورہ لو (وشاورھم فی الامر، آل عمران ۱۵۹) اس آیت کو اصول اجماع کا ماخذ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ مشورہ بھی اجماع کا ایک ضروری جزء ہے۔ اجماع حقیقۃً وہ ہے جو علمائے امّت کے باہمی مشورہ کے بعد سامنے آئے۔ اس لحاظ سے اجماع کی شرط لازم اجتماع ہے۔ کیونکہ باہمی مشورہ سے کسی متفقہ رائے پر پہنچنا صرف اس وقت ممکن ہے جبکہ تمام متعلقہ افراد کسی ایک مقام پر جمع ہوں اور آپس میں بحث و گفتگو کے بعد ایک رائے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

قتل شاتم کے مسئلہ پر پوری تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ علمار اور فقہار کا ایک مقام پر اجتماع ہو اور وہاں باہمی مشورہ کے بعد ایک متفقہ فیصلہ کیا جائے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس مسئلہ پر علمار و فقہار

کا اجماع ہے۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس مسئلہ میں جمہور (اکثریت) کی رائے یہی ہے کہ شاتم کو قتل کر دیا جائے۔ مذکورہ نوعیت کے اتفاق رائے کو اگر اجماع کہا جائے تو وہ مجازی طور پر ہوگا نہ کہ حقیقی طور پر۔

تاہم ان بحثوں سے قطع نظر، دو نہایت اہم واقعہ اس مفروضہ اجماع سے ٹکراتا ہے۔ ایک یہ کہ سارے قرآن اور سارے ذخیرۂ حدیث میں کوئی بھی ایسی نص موجود نہیں جس میں صراحتہً یہ حکم دیا گیا ہو کہ جو شخص گستاخی یا شتم کا فعل کرے اس کو فوراً قتل کر دو۔ اس کو ہرگز زندہ نہ چھوڑو، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ پورا قرآن اور تمام کتب حدیث اس طرح کے کسی صریح حکم سے خالی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ، اپنی تمام تر شہرت کے باوجود، صرف قیاسی یا استنباطی ہے، وہ کسی نص صریح سے براہ راست طور پر ماخوذ نہیں۔

دوسری بات یہ کہ علماء اور فقہاء کے حوالے سے جو مسئلہ بیان کیا جاتا ہے، وہ صرف پیغمبر اسلام کے لیے نہیں ہے۔ وہ خدا اور ملائکہ اور پیغمبر اسلام اور دوسرے تمام پیغمبروں کے لیے یکساں طور پر عام ہے، اس فقہی مسئلہ کے مطابق، اصلی اور پورا حکم یہ ہے کہ جو شخص بھی، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، اللہ یا رسولؐ یا دوسرے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کے بارہ میں گستاخی کے کلمات کہے، یا دین خدا پر کسی قسم کا عیب لگائے، تو اس کو بطور حد قتل کر دیا جائے۔ اس کے بعد اس کو ہرگز زندہ نہ چھوڑا جائے، خواہ اس نے اپنے فعل سے توبہ کر لیا ہو۔

ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الصارم المسلول علی شاتم الرسول میں کئی جگہ یہ بات لکھی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کوئی ذمی اگر رسول کو برا کہے یا اللہ کو برا کہے یا اسلام پر عیب لگائے اور ہمارے دین پر طعن کرے تو اس کا قتل واجب ہو جائے گا (ان الذمی اذا سب الرسول او سب اللہ او عاب الاسلام . . . وطعن فی دیننا فیجب قتلہ بنص الآیۃ، صفحہ ۱۷)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی کہ آپ اس شخص کا خون مباح کر دیتے تھے جو اللہ کو اور اس کے رسول کو ایذا پہنچائے اور دین میں طعن کرے (وھذہ کانت سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ کان یھدر دماء من آذی اللہ ورسولہ وطعن فی الدین، صفحہ ۱۶) واضح ہو کہ ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ "یہ رسول اللہ کی سنت تھی" صحیح نہیں۔ یہ محض تعمیم (Generalization) ہے۔ انھوں نے بعض مستثنیٰ واقعہ کو عمومی واقعہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس

نکتہ کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

حدیث قدسی (یوذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر) کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ خدا و رسول کو ایذا پہنچانا، خواہ قلیل ہو یا خفیف ہر حال میں موجب قتل ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچانے کو سبب قتل قرار دیا (فانہ جعل مطلق اذی اللہ تعالیٰ ورسولہ موجبا لقتل رجل معاھد، صفحہ ۷۳) دوسری جگہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر سب وشتم کرے وہ اگر مسلم ہے تو اس کا قتل واجب ہے (من سب اللہ تعالیٰ فان کان مسلما وجب قتلہ، صفحہ ۵۵۰)

ایک حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ ایک دلیل ہے جو اس کو واجب قرار دیتی ہے کہ نبیوں میں سے کسی نبی پر جو شخص سب وشتم کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔ اس حکم کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ وہ توبہ طلب کیے بغیر قتل کر دیا جائے گا، اور اس کا قتل بطور حد ہے (فھو دلیل علیٰ وجوب قتل من سب نبیا من الانبیاء وظاھرہ یدل علی انہ یقتل من غیر استتابۃ وان القتل حد لہ، صفحہ ۹۲) یہ حدیث اگرچہ خود ابن تیمیہ کے اقرار کے مطابق ضعیف ہے۔ مگر موجودہ بحث کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ابن تیمیہ نے اس کا حوالہ دے کر جس مسلک کو اختیار کیا ہے، وہ یہی ہے کہ کسی بھی پیغمبر پر شتم کرنے والے کو فوراً قتل کر دیا جائے گا۔

ابن تیمیہ ایک فصل کے تحت لکھتے ہیں کہ تمام پیغمبروں پر سب وشتم کرنے کا وہی حکم ہے جو ہمارے پیغمبر پر سب وشتم کرنے کا حکم ہے۔ یعنی ان سب پر سب وشتم کرنے والا کافر ہے، اور ایسے شخص کا خون حلال ہے (الحکم فی سب سائر الانبیاء کالحکم فی سب نبینا..... انّ سابھم کافر حلال الدم، صفحہ ۵۷۱ — ۵۷۰)

عبد القادر عودہ لکھتے ہیں کہ پیغمبروں اور فرشتوں کا استہزار کرنے کے بارہ میں فقہاء کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایسے شخص کو بطور حد قتل کر دیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ دوسری رائے یہ کہ ایسا شخص مرتد ہے، اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ لیکن اگر وہ دوبارہ ایسا کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ (سبّ الرسل والملٰئکۃ والاستھزاء بھم، وفی المذھب رأیان، احدھما یری القتل حدا فلا تقبل التوبۃ۔ والثانی یری انہ مرتد یقتل للردۃ فتقبل توبتہ۔ ومن تکررت ردتہ فلا تقبل توبتہ / التشریع الجنائی، الجزء الثانی، صفحہ ۷۲۶ — ۷۲۷)

حکم کی اس عمومی نوعیت کے اعتبار سے دیکھئے تو انسانی آبادی میں شاذ و نادر ہی کچھ ایسے خوش قسمت افراد ملیں گے جو اس حکم کی زد میں نہ آتے ہوں۔ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کسی نہ کسی اعتبار سے اس حکم عام کی گرفت میں آجائے گی۔ حتی کہ یہ فہرست اتنی لمبی ہوسکتی ہے کہ سب کے سب انسان قابل قتل قرار پائیں، اور پھر یہ حکم عملی طور پر کالعدم ہو جائے، کیونکہ جب سارے افراد قابلِ قتل ہوں تو وہ کون ہوگا جو ان لوگوں کے خلاف اٹھے۔ اور کون ہوگا جو انہیں قتل کرکے ان کا خاتمہ کرے۔

فقہاء نے ایک طرف شتم کی سزا بطور حد (لازمی طور پر) قتل قرار دی ہے۔ اور دوسری طرف شتم کی ایسی تعریف کی ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے شاتم قرار پاتا ہے۔

اس تعریف کے مطابق، استہزار کرنا، تنقیص کرنا، عیب لگانا، اہانت کرنا، گستاخی کرنا، لمز کرنا، ایذا رسانی کرنا، خوض اور لعب کے تحت کچھ کہنا، سب کا سب شتم میں داخل ہے۔ اس کے مطابق، نہ صرف مذمم اور ابتر اور غیر عادل جیسے الفاظ بولنا سب وشتم ہے بلکہ رسول کی دی ہوئی خبر کی اشاراتی تحقیر کرنا بھی سب وشتم میں داخل ہے۔ مثلاً یہ کہنا کہ کیا ان صاحب کا خیال ہے کہ روم کے محل اور قلعے فتح ہوں گے (ایظن ھذا ان یفتح قصور الروم وحصونھا، صفحہ ۳۴-۳۳)

موجودہ صورت میں یہ مسئلہ کس قدر سنگین ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یوذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر (صفحہ ۳۰) یعنی انسان مجھ کو ایذا پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، حالانکہ میں ہی زمانہ ہوں (ایک اور روایت کے مطابق، یہ بھی اللہ کو برا کہنا ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ نے اپنا بیٹا لیا ہے، جیسا کہ مشرکین فرشتوں کے بارہ میں کہتے ہیں اور مسیحی حضرت عیسیٰ کے بارہ میں)

اس حدیث میں جس قسم کی باتوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کو ایذا پہنچاتا ہے، وہ بہت عام ہیں۔ اس کے مطابق ہر دور کے بیشتر انسان اللہ کا سب وشتم کرنے کے جرم کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔ تمام مشرکین، تمام عیسائی، اور جدید تعلیم پائے ہوئے بیشتر لوگ مجرمین کے اس زمرہ میں داخل ہیں۔ اس لیے مذکورہ فقہی مسئلہ کے مطابق، سب کے سب اس قابل ہیں کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔

یہی معاملہ سبّ انبیاء کا بھی ہے، مثلاً یہودی بحیثیت ایک قوم حضرت مسیح علیہ السلام کو، نعوذ باللہ،

ولد الزنا کہتے ہیں۔ اسی طرح عیسائی لوگ، جو دنیا میں سب سے بڑا مذہبی فرقہ ہیں، وہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جھوٹا پیغمبر (False prophet) قرار دیتے ہیں۔ اب مذکورہ مسئلہ کے مطابق، دنیا بھر کے تمام یہودی اور تمام عیسائی واجب القتل ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے ایک ایک شخص کی گردن مار دینا چاہیے۔

یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو مشرکانہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ جو اللہ کی صفات میں سے کسی صفت میں غیر خدا کو شریک کرتے ہیں۔ اس گروہ میں معروف مشرکوں کے علاوہ بہت سے قبر پرست اور اکابر پرست مسلمان بھی شامل ہیں، وہ سب کے سب خدا کی تنقیص کرنے کے مجرم ہیں۔ وہ غیر اللہ کے لیے ایسے کلمات بولتے ہیں جو اللہ کو ایذا پہنچانے کی تعریف میں آتے ہیں، مذکورہ مسئلہ کے مطابق، یہ تمام لوگ بھی اس قابل ہیں کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ ان میں سے کوئی شخص بھی زندہ چھوڑے جانے کا مستحق نہیں۔

سب وشتم کی بنیاد پر قابل قتل افراد کی یہ فہرست یہیں پر ختم نہیں ہوتی، اس کا سلسلہ خود آیت اللہ خمینی اور ان کے متبعین تک جاتا ہے جو سلمان رشدی کو قتل کر کے اس کو "جہنم رسید" کرنے کے چیمپین بنے تھے۔ خمینی کا ولایت فقیہ کا عقیدہ اور دوسرے شیعی عقائد، سنّی علماء کے فتووں کے مطابق، خدا کی بھی توہین ہیں اور خدا کے رسول کی بھی توہین۔ ایسی حالت میں اہل اسلام پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ امام خمینی اور ان کے ہم خیال تمام لوگوں کو پکڑ پکڑ کر قتل کر ڈالیں، ان میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑیں۔

واضح ہو کہ یہ راقم الحروف کا نظریہ نہیں مگر "قتل شاتم" کے نظریہ کی وکالت کرنے والوں کے نظریہ کا لازمی تقاضا یہی ہے۔

جیسا کہ اوپر کے حوالے سے واضح ہے، دین پر عیب لگانا یا اس پر طعن کرنا بھی وہ جرم ہے جس پر آدمی کا قتل واجب ہو جاتا ہے۔ اس حکم کی روشنی میں موجودہ حالات کو دیکھئے تو آج یہ چیز بے حد عام ہو چکی ہے۔ آج کا وہ طبقہ جس کو جدید تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، وہ تقریباً ۹۹ فی صد اس جرم کا مجرم قرار پاتا ہے۔

تمام سوشلسٹ اور کمیونسٹ حضرات اس کے مطابق مجرم ہیں۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ مذہب ایک ذہنی افیون ہے۔ بقیہ لوگ بظاہر ایسے الفاظ نہیں بولتے۔ تاہم وہ بھی مہذب الفاظ میں وہی بات کہتے ہیں جس کو کمیونسٹ لوگ برہنہ الفاظ میں کہہ رہے ہیں۔

اس طرح مذکورہ مسئلہ کے مطابق، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی تقریباً ۹۹ فی صد تعداد اس قابل ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائے یا گولی مار کر اس کو ہلاک کر دیا جائے۔

مزید یہ کہ اس نظریہ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سب وشتم کی سزا کے نفاذ کے لیے کسی حکومت یا کسی عدالتی کارروائی کی ضرورت نہیں۔" اسلامی حکومت اگر یہ سزا نافذ نہ کر رہی ہو تو کوئی بھی مسلمان اس کو نافذ کر سکتا ہے، اور ایسے شخص کو بطور خود قتل کر سکتا ہے۔" راقم الحروف کے نزدیک یہ نظریہ سراسر لغو ہے۔ تاہم قتل شاتم کے حامیوں کے نزدیک مسئلہ کی نوعیت یہی ہے۔

شتم کے معاملہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک عجیب تضاد میں مبتلا ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جب مسئلہ بیان کرنا ہو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا کے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر پر سب وشتم کرنا یکساں طور پر جرم ہے۔ وہ ایسے ہر شاتم کو واجب القتل قرار دے دیتا ہے۔ مگر عملی اعتبار سے ان کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اپنے پیغمبر کے سب وشتم پر بھڑکتے ہیں۔ جہاں تک دوسرے پیغمبروں کا تعلق ہے، ان کے خلاف خواہ کسی بھی قسم کی گستاخی کی جائے، ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی بے شمار تصویریں بنائی گئی ہیں، وہ کروروں کی تعداد میں کتابوں اور گھروں وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر اس تصویر سازی پر مسلمانوں کے اندر کوئی اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اپنے پیغمبر کے بارہ میں اگر وہ صرف دور کی ایک خبر سن لیں تو فوراً مشتعل ہو کر آمادۂ فساد ہو جائیں گے۔ اسی طرح دوسرے پیغمبروں کے بارہ میں بے شمار گستاخانہ باتیں بولی اور چھاپی جا رہی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو اس کے بارہ میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اس وقت مضطرب ہوتے ہیں جب کہ اس بری خبر کا تعلق ان کے اپنے پیغمبر سے ہو۔

یہ معاملہ یہاں تک پہنچا ہے کہ نہ صرف اغیار بلکہ مسلمان خود بھی اپنے پیغمبر کی تعظیم اور دوسرے پیغمبروں کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں، اس کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ہندو یا عیسائی یا یہودی یہ لکھ دے کہ "مکہ وہ بستی ہے جس کو چھوڑ کر حضرت محمد بھاگے تھے"، تو تمام مسلمان بپھر اٹھیں گے اور اس کتاب کو جلانا شروع کر دیں گے جس میں ہجرت کے لیے بھاگنے کا لفظ لکھا گیا ہے۔ مگر خود ان کا ایک شخص لکھتا ہے کہ "یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونسؑ بھاگے تھے" (تفہیم القرآن ۴/۳۰۹)، تو مسلمانوں کے اندر اس گستاخی پر کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ روش خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کے ہم معنی ہے۔ اور جو لوگ رسولوں کے درمیان تفریق کریں، وہ ایک کے ساتھ کچھ معاملہ کریں اور دوسرے کے ساتھ کچھ، وہ اللہ کے یہاں سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔

حقیقت یہ ہے کہ "قتل شاتم" کا مذکورہ مسئلہ ناقابل فہم حد تک بے اصل مسئلہ ہے۔ اس کے لیے کتاب وسنت میں کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔ اور نہ اسلام کی تاریخ میں، آغاز سے لے کر اب تک، کبھی اس کو عملی طور پر اختیار کیا گیا۔ اور نہ امکانی طور پر اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ مسئلہ کو سامنے رکھیے اور اسلام کی تاریخ کو دیکھیے، تو معلوم ہوگا کہ ساری اسلامی تاریخ میں کبھی بھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں جو عیسائی تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود ساختہ نبی کہتے تھے۔ یہودی دہرا مجرم تھے، کیونکہ وہ پیغمبر اسلام کی بھی تحقیر کرتے تھے اور حضرت مسیحؑ کی بھی۔ اس وقت وہاں جو مشرکین تھے، وہ پیغمبر کی توہین وتحقیر کے علاوہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اس طرح ان کا جرم اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو قدیم عرب کی آبادی میں کم از کم ۹۵ فی صد لوگ ایسے تھے جو کسی نہ کسی قسم کے شتم یا ایذا رسانی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اب اگر شرعی مسئلہ یہی ہے کہ ایسے لوگوں کو بے دریغ قتل کر دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہیے تھا کہ عرب کی بیشتر آبادی کو تہ تیغ کر ڈالتے۔ اور جب یہ قتل بطور حد تھا تو از روئے مسئلہ آپ ان کو معاف بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں یہی کیوں نہ ہو کہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوں تو جزیرہ نمائے عرب میں چاروں طرف قبروں کے سوا کوئی اور منظر دکھائی نہ دے، بشرطیکہ وہاں کوئی دیکھنے والا بھی زندہ حالت میں موجود ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے زمانہ میں بھی ہمیشہ یہی صورت کم وبیش جاری رہی۔ سب وشتم کا جو عمومی مفہوم فقہاء نے بیان کیا ہے، اس کے لحاظ سے دوبارہ دنیا کی آبادی کا کم از کم ۹۵ فی صد حصہ کسی نہ کسی اعتبار سے خدا یا پیغمبر اسلام یا دوسرے پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کی تنقیص اور گستاخی کے جرم کا مرتکب ہو رہا تھا۔ اس لیے دوبارہ یہی عمل ساری دنیا میں جاری ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کی آبادی کے بیشتر حصہ کو قتل کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ زمین کے اوپر شاتمین کی قبروں کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہ دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم حق کے داعی تھے، آپ کا کام شاتم کو سزا دینا نہ تھا، آپ کا اصل کام شاتم کو مومن بنانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں آپ کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے ——— اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو رحمتِ عالم کا لقب دیا تھا۔ مگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کا نام تاریخ میں نعوذ باللہ قاتلِ عالم کی حیثیت سے درج کیا جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر اب تک کبھی اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس عرصہ میں بعض استثنائی افراد ضرور قتل کیے گئے ہیں جن کے ساتھ دوسرے اسباب مثلاً نقض عہد (غدر اور بغاوت) کا جرم شامل تھا۔ مگر مجرد لفظی ایذا رسانی کی بنیاد پر اس قسم کے قتل عام کا نہ کبھی کسی عالم نے نام زد فتوی دیا اور نہ کبھی کسی حاکم نے اس پر عمل درآمد کیا۔

بعض افراد جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر قتل کرایا، یا جن سے جنگ کی وہ براہ راست خدائی حکم سے تھا جو صرف پیغمبر کے لیے خاص ہوتا ہے۔ تمام پیغمبروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب ان پر خدا کا پیغمبر اتمام حجت کر دے تو اس کے بعد ان کے لیے زمین پر زندہ رہنے کا حق باقی نہ رہے۔

پچھلے پیغمبروں کی مخاطب قوموں کے ساتھ اس سنت الٰہی کا ظہور زیادہ تر اس طرح ہوا کہ سمندر یا طوفان یا زلزلہ جیسی قدرتی آفات کے ذریعہ انھیں تباہ کر دیا گیا (العنکبوت ۴۰) مگر مخصوص مصالح کی بنا پر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی مخاطب قوم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوا کہ خود اہلِ ایمان کے ذریعہ اس پر اس خدائی سزا کا نفاذ کیا جائے (قاتلوهم يعذبهم الله بايديكم)

اس نوعیت کا قتل یا قتال انتہائی استثنائی معاملہ تھا۔ اس کا تعلق خصوصی طور پر صرف پیغمبر سے ہے۔ وہ پیغمبر انہ اتمام حجت کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ سادہ طور پر گستاخی اور بدزبانی کے مسئلہ سے۔ پیغمبر کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس طرح کے واقعات کا حوالہ دے کر اپنے زمانہ کے لوگوں کو قتل کرنے لگے۔ بعد کے لوگوں کو صرف دعوت دینا ہے اور بقیہ تمام باتوں کو اللہ کے اوپر چھوڑ دینا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اور ملائکہ اور انبیاء کے خلاف گستاخی کرنا یا دین پر عیب لگانا، ایک اعتراض ہے نہ کہ سادہ معنوں میں محض ایک جرم۔ عام قسم کے سماجی یا اخلاقی جرم کا توڑ جسمانی سزا کے ذریعہ کیا

جاسکتا ہے، مگر ایک فعل جو اعتراض اور تنقید کی نوعیت کا ہو، اس کا دفعیہ صرف جسمانی سزا کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس کا واحد توڑ یا دفعیہ یہ ہے کہ اس کو دلائل سے رد کیا جائے۔ معترض کے الفاظ کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور الفاظ سے اس کو بے حقیقت ثابت کر دیا جائے۔

ان واضح اسباب کی بنا پر راقم الحروف کی قطعی رائے ہے کہ قتل شاتم کے بارہ میں "جمہور فقہاء" کا جو مسلک نقل کیا جاتا ہے، وہ یا تو اس معنی میں نہیں ہے جس معنی میں ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال لوگ اس کو لے رہے ہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اس معنی میں ہو تب بھی وہ یقینی طور پر قابل لحاظ نہیں۔

یہ مسئلہ دین میں ایک ایسا اضافہ ہے جس کے لیے نہ قرآن و حدیث میں کوئی صریح نص موجود ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اس کی تصدیق ملتی ہے۔ مزید یہ کہ اس مسئلہ کو بجنسہ ماننے کی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پوری اسلامی تاریخ میں تمام علماء اور سلاطین مسلسل اس شرعی حکم کی خلاف ورزی کرتے رہے ہیں۔ حتی کہ خلاف ورزی کرنے والوں کی اس لمبی فہرست میں، نعوذ باللہ، خود رسول اور اصحاب رسول بھی شامل ہیں۔

قرآن و سنت سے اس نظریہ کی عدم مطابقت اتنی واضح ہے کہ خود علامہ ابن تیمیہ کو اس کا پورا احساس ہے۔ چنانچہ اپنی ۶۰۰ صفحہ کی کتاب (الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسول) میں انھوں نے جگہ جگہ اس کا جواب دیا ہے اور یہ توجیہہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے مفروضہ شرعی مسئلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں عمل نہیں فرمایا۔ کیوں آپ نے ایسا کیا کہ بے شمار گستاخی کرنے والوں کو سزا دیے بغیر چھوڑ دیا۔ مگر ان کی یہ نام نہاد توجیہات "عذر گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق ہیں۔

مثلاً کتاب میں وہ ایک جگہ مدینہ کے بعض منافقین کا ذکر کرتے ہیں۔ ان منافقین نے مبینہ طور پر رسول کا استہزاء کیا تھا۔ اس کے باوجود انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر استہزاء کی حد اس لیے جاری نہیں کی گئی، کیونکہ اس وقت تک منافقین کے خلاف جہاد فرض نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ آپ کو یہ حکم تھا کہ ان کی ایذا رسانی کو نظر انداز کریں اور جو شخص آپ کی تنقیص کرے اس کو معاف کر دیں:

انما لم یقم الحد علیهم لکون جهاد المنافقین لم یکن قد امر به اذ ذاك بل کان مامورا بان یدع اذاهم ولانه کان له ان یعفو عمن تنقصه واذاه، صفحہ ۳۴

ابن تیمیہ کے اس بیان کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم تھا کہ وہ منافقین کی تنقیص اور ایذا رسانی پر اعراض کریں اور ان کو معاف کر دیں۔ لیکن ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ یہ وقتی حکم تھا جو بعد کو منسوخ ہو گیا۔ مگر صرف اتنا کہنا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ابن تیمیہ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ یہ حکم کب منسوخ کیا گیا۔

حدیث اور سیرت سے تو یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر وقت تک ان منافق افراد کا قتل عام نہیں کرایا جو آپ کے خلاف استہزار اور گستاخی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی اتری اور آپ نے اپنے عمل سے جو نمونہ پیش فرمایا، اس کے مطابق عفو و اعراض کا یہ حکم آخر تک باقی رہا۔ وہ کبھی منسوخ نہیں کیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن و سنت سے اس حکم کی منسوخی ثابت نہیں تو پھر دوسرا کون سا ذریعہ ہے جس سے ابن تیمیہ کو معلوم ہوا کہ یہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے۔ کیا محمد بن عبد اللہ کے بعد کوئی اور پیغمبر آیا ہے جس نے انھیں یہ خبر دی ہے کہ عفو و اعراض کا حکم اب منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اب تم لوگ ایسے تمام افراد کو چن چن کر قتل کر ڈالو۔

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو ابن تیمیہ کو اور ان کے تمام ہم خیال لوگوں کو وہی کہنا چاہیے اور کرنا چاہیے جس کا نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ نہ کہ خود ساختہ تاویلات کے ذریعہ اس کو منسوخ قرار دیں اور پھر ایک ایسے عمل کی وکالت کریں جس کا براہ راست ثبوت نہ قرآن میں ہے، نہ رسول کے قول اور عمل میں۔ ان کے اس نظریہ کی بنیاد صرف قیاس پر ہے، اور قیاس اس طرح کے معاملہ میں حجت نہیں۔

چنانچہ ہر زمانہ میں ایسے محقق علما موجود رہے ہیں جنھوں نے اس کے خلاف رائے دی۔ سفیان الثوری (۹۷-۱۶۱ھ) کو سید اھل زمانہ فی علوم الدین کہا جاتا ہے۔ مرتد کے بارہ میں ان کا قول ہے کہ یُستتابُ ابداً و لا یُقتل (اس سے ہمیشہ توبہ کے لئے کہا جائے گا، اس کو قتل نہیں کیا جائے گا)۔ یہی حکم شاتم کا بھی ہے، کیوں کہ شاتم کا حکم حدیث ارتداد ہی سے اخذ کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اور مستہزئین

واقعات بتاتے ہیں کہ جس طرح دوسرے نبیوں کا استہزار کیا گیا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی استہزار کیا گیا۔ اس سلسلہ میں بے شمار واقعات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب آپ کے ساتھ استہزار اور اہانت کا معاملہ کیا گیا تو اس کے جواب میں آپ نے کیا کیا۔ تاکہ آپ کے بعد جب اس قسم کے واقعات پیش آئیں تو ہم اس معاملہ میں اسی اسوۂ نبوی کو اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر اعتبار سے ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ اور یقیناً اس معاملہ میں بھی ہمیں اسی نمونہ کو اختیار کرنا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی عمل سے ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس نوعیت کے جو واقعات ہیں، ان کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ نے ان واقعات کو مسئلہ کی نظر سے دیکھا، نہ کہ سادہ طور پر محض گستاخی کی نظر سے۔ کسی واقعہ کو مسئلہ کی نظر سے دیکھا جائے تو اس سے حل تلاش کرنے کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کو گستاخی کی نظر سے دیکھئے تو صرف انتقام کا جذبہ ابھرے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے اس طرح کے واقعات کو کبھی گستاخی اور توہین کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ کبھی ان کا انتقام لینے کی کوشش کی۔ آپ نے ہمیشہ ان واقعات کو مسئلہ کی نظر سے دیکھا اور ان کو حکمت اور تدبر کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں آپ کی کئی سنتیں ہمیں ملتی ہیں۔ اور یہ بالکل فطری ہے۔ کیونکہ جب مسئلہ کو حل کرنے کی نظر سے دیکھا جائے تو حالات کے اعتبار سے لازماً اس کے طریقے مختلف ہو جائیں گے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ "گستاخی" کے واقعات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی وہ طریقہ اختیار نہیں کیا جو موجودہ زمانہ کے مسلمان مستقل اور مسلسل طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یعنی گستاخ آدمی کے خلاف شور وغل اور ایجی ٹیشن کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بار بار گستاخی اور اذیت رسانی کے واقعات پیش آئے، مگر ایک بار بھی

آپ نے ان کے خلاف عمومی احتجاج کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔

اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ گستاخی کی بات کو عوامی ایجی ٹیشن کا موضوع بنانا خود گستاخ شخص کے ساتھ تعاون کرنے کے ہم معنی ہے۔ کیونکہ اس طرح اس کی بات مزید پھیلتی ہے، وہ مزید شہرت حاصل کرتی ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں عوامی ایجی ٹیشن کا طریقہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا ہے۔ (Counter productive)

اس کی ایک مثال سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (*The Satanic Verses*) کا معاملہ ہے۔ یہ کتاب بلاشبہ ایک بے ہودہ کتاب ہے۔ عام حالات میں اس کو بمشکل چند ہزار آدمی پڑھتے۔ مگر مسلمانوں کے ناقابل فہم حد تک بے معنی ایجی ٹیشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی کتابوں کی مارکیٹ میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب (Best seller) بن گئی۔ نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ٹائمس آف انڈیا (۱۷ مارچ ۱۹۸۹) میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ نیویارک ٹائمز کے جائزے کے مطابق موجودہ ناولوں میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب شیطانی آیات ہے:

'The Satanic Verses' has become the no. 1 book on *The New York Times* best-seller list of hard cover fiction.

ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ ۲۷ فروری ۱۹۸۹ میں رشدی کی کتاب کے بارہ میں اپنی رپورٹ شائع کی تھی۔ اس کو پڑھ کر ٹائم کے دفتر میں ۲۴۰ خطوط آئے۔ ان میں سے ایک خط مارگریٹ ڈوریٹز (Margareta du Rietz) کا تھا۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا کہ بہت ہی کم لوگوں نے اس کتاب کی طرف توجہ کی تھی۔ مگر خمینی کا بھلا ہو، اب وہ ایک عالمی شہرت یافتہ کتاب ہے:

Very few took note of this novel. Now, thanks to Khomeini, it is world famous.

سلمان رشدی نے اپنے بے ہودہ خیالات صرف اپنی کتاب میں لکھے تھے۔ مگر مسلمانوں کے شور و غل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی باتیں تمام دنیا کے اخبارات و رسائل میں چھپیں۔ بے شمار لوگ غیر ضروری طور پر اس کی کتاب کو پڑھنے کے شائق ہو گئے۔ اب امریکہ میں ۲۰ زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ جو لوگ انگریزی نہیں جانتے وہ بھی اس "شہرت یافتہ" کتاب

کو پڑھ سکیں۔ مسلمانوں کے اس احمقانہ اقدام کا آخری احمقانہ نتیجہ یہ ہے کہ "سلمان رشدی کو قتل کرو" کے نام پر جو ہنگامہ کھڑا کیا گیا، اس میں خود مسلمان درجنوں کی تعداد میں قتل اور سیکڑوں کی تعداد میں زخمی ہو گئے۔ اور خود سلمان رشدی ادبی ہیرو بن کر برطانیہ کی شاہی حفاظت میں بیٹھا ہوا ہے۔

۲۔ اہانتِ رسول کے اس طرح کے واقعات پر مسلم رہنماؤں کی طرف سے جو بیانات دیے جاتے ہیں، ان میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس سے کروروں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ یہ سراسر ایک غیر اسلامی جملہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مواقع پر کبھی یہ الفاظ استعمال نہیں کیے۔ مزید یہ کہ اسلام کے "کریمنل کوڈ" میں ایسی کوئی دفعہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے کو فوجداری جرم قرار دیا گیا ہو اور اس پر موت کی سزا مقرر کی جائے۔ یہ بلاشبہ شریعتِ اسلامی میں ایک اضافہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مجروح ہونے کو ایک قابل دست اندازی پولیس جرم قرار دیا جائے۔ اس قسم کے بیانات دینا سب سے پہلے بیان دینے والے کو مجرم ثابت کرتا ہے نہ کہ گستاخی کرنے والے کو۔

۳۔ سلمان رشدی کے سلسلہ میں مسلم رہنماؤں کی طرف سے جو بیانات شائع ہوئے ہیں ان میں عام طور پر "جہنّم رسید" کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ ہر بیان باز لیڈر جوش و خروش کے ساتھ یہ اعلان کر رہا ہے کہ سلمان رشدی کے جرم کے نتیجہ میں اس کو جلد از جلد جہنّم رسید کیا جائے۔

مسلم رہنماؤں کے یہ الفاظ سرکشی اور بغاوت کے ہم معنی ہیں۔ کیونکہ جہنّم رسید کرنے کا اختیار صرف خدا کو ہے نہ کہ کسی انسان کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے کافروں اور مشرکوں اور منافقوں نے آپ کے خلاف بدترین قسم کے جرائم کیے۔ مگر ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ الفاظ بولیں کہ فلاں شخص کو قتل کر کے اس کو جہنم رسید کرو۔ ایسے الفاظ بولنا گویا اپنے آپ کو خدا کی سیٹ پر بٹھانا ہے۔ رشدی نے اگر پیغمبر کی ذات پر حملہ کیا ہے تو ایسے جملے خود خدا کی ذات پر حملہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ اب ایسے لوگ خود یہ سوچیں کہ دونوں میں سے کون سا جرم زیادہ بڑا ہے۔

۴۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اس طرح کے معاملات میں پیغمبر کا طریقہ "گستاخی" کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کا نہ تھا بلکہ مسئلہ کو حل کرنے کا تھا۔ چنانچہ حالات کے اعتبار سے آپ نے اس کے حل

کے مختلف انداز اختیار کیے۔

ایک عام حل یہ تھا کہ ان کو سادہ طور پر نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا کہ اے پیغمبر . . . تم منکروں اور منافقوں کی بات نہ مانو۔ اور ان کے ستانے کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ بھروسہ کے لیے کافی ہے (الاحزاب ۴۸)

التفسیر المظہری میں اس آیت کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ عبد اللہ بن عباس نے اور قتادہ نے کہا کہ لوگ تم کو جو تکلیف دے رہے ہیں اس پر صبر کرو۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی ایذا رسانی سے صرف نظر کرو۔ اس کی پروا نہ کرو۔ اور نہ اس سے ڈرو۔ زجاج نے کہا کہ ان سے بحث نہ کرو۔ ان کی باتوں کے پیچھے نہ پڑو۔ اور نہ تم خود انہیں تکلیف پہنچانے کی کوشش کرو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو، وہ یقیناً تمہارے لیے کافی ہے (المجلد السابع، صفحہ ۳۵۵)

یہی پیغمبرانہ سنّت ہے جس کو حضرت عمر فاروق رضؓ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا کہ باطل کو ہلاک کرو اس کے بارہ میں چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنہ) یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر حالات میں باطل کی موت کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی جائے۔ ایسا طریقہ اختیار کرنے کے بعد باطل اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ پھر جو سانپ لاٹھی کے بغیر مر سکتا ہو، اس کے لیے لاٹھی استعمال کرنے کی کیا ضرورت۔

۵۔ ایک طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت میں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ مخالفین کی باتوں کا جواب دلیل کی زبان میں دیا جائے۔ قدیم زمانہ میں شعر کو وہ مقام حاصل تھا جو موجودہ زمانہ میں صحافت کو حاصل ہے۔ صحافت موجودہ زمانہ میں کسی بات کو وسیع حلقہ میں پھیلانے کا ذریعہ ہے۔ یہی کام قدیم زمانہ میں اشعار سے لیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے مخالفین اشعار کی صورت میں آپ کی مذمّت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ہند نے آپ کے خلاف یہ اشعار کہے:

مذمماً عصینا وامره ابینا ودینه قلینا

یعنی محمد مذمّت کیے ہوئے ہیں، ہم ان کا انکار کرتے ہیں۔ ہم ان کے حکم کو نہیں مانتے۔ اور ہم کو ان کے دین سے بغض ہے (سیرت ابن ہشام، الجزء الاوّل صفحہ ۳۷۹)

اس طرح کے مواقع پر مسلمانوں کے شاعر حضرت حسّان بن ثابت شعر کا جواب شعر میں دیتے تھے۔ مثلاً ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں ایک مشرک عورت کا ذکر کیا ہے۔ جس نے اسلام اور اہل اسلام پر عیب لگاتے ہوئے کچھ اشعار کہے (فقالت تعیب الاسلام واھلہ) مذکورہ مشرکہ کے ہجو کے جواب میں حسّان بن ثابت نے اسی بحر میں کچھ اشعار کہے۔ یہ دونوں قسم کے اشعار ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں نقل کیا ہے (الجزء الرابع، صفحہ ۳۱۴)

اسی طرح ایک موقع پر ایک جاہلی شاعر نے اسلام کے خلاف کچھ باتیں کہیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسّان بن ثابت سے کہا کہ اے حسّان، اٹھو اور اس آدمی نے جو کچھ کہا ہے اس کا جواب دو۔ چنانچہ حسان اٹھے اور انھوں نے برجستہ کچھ اشعار وضع کر کے مذکورہ شخص کا جواب دیا (قم یاحسّان فاجب الرجل فیما قال۔ قال فقام حسّان فقال، الجزء الرابع صفحہ ۲۲۷)

۶۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حنین میں) عباس بن مرداس کو چند اونٹ دیے۔ یہ اونٹ اس کو کم معلوم ہوئے۔ چنانچہ وہ غصہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرنے لگا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ میری طرف سے اس کی زبان کاٹ دو۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کو مزید اونٹ دیے یہاں تک کہ وہ راضی ہو گیا۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ تھا زبان کا کاٹنا جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ (فکان ذلک قطع لسانہ الذی امر بہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) الجزء الرابع، صفحہ ۱۴۱)

اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اصل مسئلہ ہجو گو کو سزا دینے کا نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی زبان کو بند کرنا ہوتا تھا۔ حالات کے اعتبار سے آپ اس کے لیے کوئی ایک یا دوسری تدبیر اختیار فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر کسی شخص کے متعلق یہ نظر آتا تھا کہ وہ مال پاکر چپ ہو جائے گا تو آپ اس کو مال دے کر اس کی زبان بندی فرماتے تھے۔

۷۔ جب مکہ فتح ہوا تو مکہ کے مشرکین آپ کے سامنے لائے گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہر قسم کا ایذا رسانی کا فعل کیا تھا۔ لفظی استہزاء سے لے کر عملی جارحیت تک کوئی بھی ایسی برائی نہ تھی جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ کی ہو۔ عام رواج کے مطابق ان سب کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایسا نہیں کیا بلکہ سب کو ایک طرف سے معاف کر دیا۔ اور فرمایا کہ جاؤ تم سب آزاد ہو۔
(اذھبوا فانتم الطلقاء)

راوی کہتے ہیں کہ یہ مشرکین آپ کے پاس سے نکلے، گویا کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں۔ اس کے بعد وہ اسلام میں داخل ہو گئے (فخرجوا کانما نشروا من القبور، فدخلوا فی الاسلام)
حیاۃ الصحابۃ، الجزء الاول، صفحہ ۱۷۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنّت بتاتی ہے کہ اذیت پہنچانے والوں کے بارے میں کرنے کا ایک کام یہ ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے، حتّٰی کہ اس وقت بھی جب کہ وہ پوری طرح اپنے قابو میں آ چکے ہوں۔ اور ان کا جرم اتنا واضح ہو کہ خود عالمی رواج کے مطابق اس بات کا پورا حق حاصل ہو کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی کے بعد ان دشمنوں کا اسلام قبول کر لینا بتاتا ہے کہ وہ کون سی خاص حکمت تھی جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ایسا فیاضانہ سلوک کیا۔ وہ حکمت یہ تھی کہ یہ بہترین موقع تھا جب کہ انہیں چھوڑ کر ان کو دوبارہ مسخر کر لیا جائے۔ جو لوگ ماضی میں اسلام کے دشمن تھے، ان کو مستقبل میں اسلام کا دوست اور حامی بنا لیا جائے۔

رسول اللہ نے جب ان مجرموں کو معاف کر دیا تو گویا کہ آپ نے ان پر سب سے زیادہ سخت حملہ کیا۔ آپ نے ان کی سابقہ سرکشی اور عناد کو نفسیاتی طور پر قتل کر ڈالا۔ اس غیر معمولی سلوک نے ان کے مصنوعی انسان کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کی ہستی میں جو چیز بچی وہ صرف فطری انسان تھا۔ اس فطری انسان نے عین اپنے اندرونی تقاضے کے تحت اسلام قبول کر لیا۔

زیادہ بڑا مجرم

سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کی موجودہ تحریک ناموس رسول کی حفاظت کے نام پر چل رہی ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس تحریک نے صرف رسول کی ناموس کو پامال کرنے کا کام انجام دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی امتیازی حیثیت، قرآن کے مطابق آپ کا پیغمبر رحمت ہونا ہے۔ مگر اس نام نہاد تحریک نے آپ کا تعارف دنیا کے سامنے، نعوذ باللہ، پیغمبر فساد کے روپ میں پیش کیا ہے۔ غالباً یہی وہ صورت حال ہے جس کی بابت شاعر اسلام نے کہا تھا:

امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

سلمان رشدی کے خلاف ایجی ٹیشن میں مسلمانوں نے جگہ جگہ تشدد کے مظاہرے کیے ہیں۔ انھوں نے دوسروں کے جان اور مال کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس قسم کا فعل نہ صرف کرنے والے کے لیے ناجائز ہے بلکہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ازالۂ حیثیت عرفی کا درجہ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر لندن کی خبروں میں بتایا گیا ہے کہ ۶ جولائی ۱۹۸۹ کی صبح کو لندن کی ایک بہت بڑی کتابوں کی دکان میں بم پھینکا گیا جس کے نتیجہ میں اس کی عمارت کا ایک حصہ برباد ہو گیا۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ بم اینٹی رشدی احتجاجیوں نے پھینکا تھا:

Early this morning, one of the largest book stores in central London — Collet's — was partially destroyed by a firebomb suspected to have been thrown by anti-Rushdie protesters (p. 14).

یہ ٹائمس آف انڈیا (۷ جولائی ۱۹۸۹) کی خبر ہے۔ قومی آواز (۷ جولائی ۱۹۸۹) کی خبر میں یہ اضافہ ہے کہ لندن کی اس دکان سے کرسمس کے بعد سے "شیطانی آیات" کی کوئی ایک بھی جلد فروخت نہیں کی گئی (صفحہ ۲)

اس قسم کے واقعات جدید انسان کے لیے وحشت اور بربریت کے ہم معنی ہیں۔ مسلمان اگر ان باتوں کو اپنی قومی سرکشی کے نام پر کرتے تو وہ ان کے قومی خانہ میں لکھا جاتا۔ مگر وہ ان کو پیغمبر اسلام کے نام پر کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے خانہ میں لکھا جائے۔ لوگ یہ سمجھیں کہ پیغمبر اسلام نے اپنے پیروؤں کو جو تعلیم دی ہے وہ یہی ہے۔ رشدی نے "شیطانی آیات" لکھ کر خود اپنے آپ کو بدنام کیا تھا، مگر مسلمان اپنی ان حرکتوں سے خود پیغمبر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں، اب ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ بڑا مجرم ہے۔

چوتھا باب

مصلحت دعوت

عبداللہ بن ابی مدینہ کا ایک منافق مسلمان تھا۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت عناد تھا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہایت بے ہودہ قسم کی گستاخیاں کیں۔ آپ کی ازواجِ مطہرات کے خلاف گھناؤنے الزامات لگائے۔ حتّٰی کہ اس کا مجرم اکبر ہونا خود قرآن (النور ۱۱) میں ثبت کر دیا گیا۔

عبداللہ بن ابی کے اس مجرمانہ فعل کو دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اگر میں ایسا کروں تو لوگ چرچا کریں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور آپ کی ازواج مطہرات کی کردار کشی نہایت سنگین بات ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ سنّت بتاتی ہے کہ ایک اور بات ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور وہ ہے ـــــ لوگوں کو اسلام کی تصویر بگاڑنے کا موقع دینا۔

ایک گستاخ رسول کو سزا دینے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کو بہانہ بنا کر اسلام کی دعوتی تصویر کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے، تو ایسی حالت میں اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت کو ترجیح دی جائے گی اور گستاخ رسول کی سزا کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوت اور دعوت کا مفاد ہے۔ بقیہ چیزوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔

اسلام کے اس تقاضے کی روشنی میں موجودہ مسلمانوں کے اس شدید ردِّ عمل پر غور کیجئے جو انہوں نے سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف ساری دنیا میں ظاہر کیا ہے۔ اس معاملہ میں یہ یقینی تھا اور ہے کہ سلمان رشدی کو اگر قتل کر دیا جائے، یا اس کے خلاف قتل کا "فتویٰ" جاری کیا جائے تو عالمی پریس اور غیر مسلم صحافت اس کو بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کی تصویر بگاڑنے کے لیے استعمال کرے گا۔

عبداللہ بن ابی کے قتل پر قدیم زمانہ میں اسلام کو بدنام کرنے کا جو عمل کیا جاتا اس کا اثر مدینہ یا زیادہ سے زیادہ عرب تک محدود رہتا، مگر سلمان رشدی کے معاملہ میں اس کا زبردست اندیشہ تھا کہ اس کے خلاف قتل کے فتویٰ کو لے کر سارے کرۂ ارض پر اسلام کو بدنام کرنے کی مہم جاری کر دی جائے گی، جیسا کہ فی الواقع ہوئی۔

سلمان رشدی کے معاملہ میں غور کرنے کا سب سے زیادہ قابلِ لحاظ پہلو یہی ہے مگر یہی وہ پہلو ہے جس کو موجودہ مسلم رہنماؤں نے اور ان کی پیروی میں عام مسلمانوں نے سب سے زیادہ نظر انداز کیا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں نے بلاشبہ اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی۔ رسول کے نام پر رسول کے طریقہ کی خلاف ورزی کی اس سے زیادہ سنگین مثال شاید پوری اسلامی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

نیویارک کے ٹائم میگزین (۲۰ مارچ ۱۹۸۹ء) میں اُٹاوہ کے عبدالحسین ماجد کفائی کا خط چھپا ہے۔ وہ سلمان رشدی کی کتاب کو قابلِ مذمت کتاب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ زیادہ بہتر تھا کہ رشدی کو زندہ رہنے دیا جائے اور تمام لوگ اس پر لعنت کریں، بمقابلہ اس کے کہ رشدی کو قتل کر دیا جائے اور پھر تمام لوگ مسلمانوں پر لعنت کریں :

It is better to let Rushdie live and be cursed by fanatical Muslims than have him killed and the Muslim world cursed by all.

راقم الحروف عبدالحسین ماجد کفائی کے اس تبصرہ سے متفق ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت میں مقامِ محمود پر فائز کیے جا چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ کسی "رشدی" کی تحریریں اس کو ادنیٰ درجہ میں بھی داغدار کر سکیں۔

مگر رشدی کے خلاف مسلمانوں نے قتل کا فتویٰ دے کر جو ہنگامہ برپا کیا، اس نے اسلام کے معاندین کو اس بات کا سنہری موقع دے دیا کہ وہ اس کو لے کر اسلام کو بدنام کریں۔ وہ تمام دنیا کو یہ تاثر دیں کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے، وہ قتل و خون کا دین ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کر کے مسلمانوں نے پایا کچھ نہیں، البتہ انھوں نے ایک بہت بڑی چیز کھو دی اور جو چیز انھوں نے کھوئی وہ وہی چیز ہے جو اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ حیثیت رکھتی ہے اور وہ ہے دعوتِ اسلامی کے مواقع۔

قدیم عرب میں جو "میڈیا" اہلِ کفر کے پاس تھا، وہی میڈیا اہلِ اسلام کے پاس بھی تھا۔ اس معاملہ میں دونوں برابر تھے۔ موجودہ زمانہ میں صورتِ حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ آج عالمی صحافت کا زمانہ ہے۔ مگر صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس ایک بھی ایسا اخبار یا ایسا میگزین نہیں جو عالمی سطح پر پھیلے اور تمام قوموں کے درمیان پڑھا جائے۔ دوسری طرف غیر مسلم اقوام کا حال یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر عالمی صحافت پر قابض ہیں۔ ان کے پاس ایسے اخبارات و رسائل ہیں جو کروروں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور ساری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں۔

اس فرق نے بے حد نازک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی بات صرف ان کے اپنے مقامی یا گروہی پرچوں میں چھپتی ہے، وہ اس کو خود ہی چھاپتے ہیں اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ جبکہ فریقِ ثانی کا یہ حال ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باتوں کو اپنے عالمی پرچوں میں چھاپتا ہے اور رات دن کے اندر ان کو ساری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔

ایسی صورتِ حال میں مسلمانوں کو نازک معاملات میں ہنگامہ آرائی کرنے سے انتہائی حد تک پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ان کی ہنگامہ آرائی کا کوئی مثبت فائدہ تو ان کو نہیں پہنچے گا، البتہ یہ منفی نقصان ہوگا کہ غیر مسلم عالمی صحافت اس کو شوشہ بنا کر ساری دنیا میں انہیں بدنام کرے گی۔ وہ بے بسی کے ساتھ اپنی اور اسلام کی بدنامی کو دیکھیں گے اور اس کے دفعیہ کے لیے کچھ نہ کر سکیں گے۔

پیغمبر کا طریقہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کا استقبال ان کی قوموں نے بہت بُرے انداز سے کیا۔ انھوں نے ان کا مذاق اُڑایا۔ ان کی تحقیر و تذلیل کی۔ ان کے اوپر جھوٹے الزامات لگائے، وغیرہ۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا کہ اس قسم کے مجرمین کو گردن زدنی قرار دے کر فوراً انہیں قتل کر دیا جائے۔ بلکہ دلیل کے ذریعہ ان کی بات کی کاٹ کی گئی۔ مثال کے طور پر اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے۔

ویقولون انہ لمجنون۔ وما ھو الا ذکر للعالمین (القلم ۵۱-۵۲) اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ضرور دیوانہ ہے۔ حالانکہ وہ صرف نصیحت ہے سارے عالم والوں کے لیے۔

ان آیات پر غور کیجئے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ لوگ خدا کے پیغمبر کو مجنون کہتے ہیں، اس لیے انہیں فوراً قتل کر دو۔ بلکہ دلیل کی زبان میں ان کی بات کو رد کیا گیا۔ اس آیت کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ اے پیغمبر کو مجنون کہنے والو، پیغمبر کے کلام کو دیکھو۔ کیا مجنون کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے۔ جس قرآن کو وہ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے، وہ سراپا نصیحت ہے۔ اس میں ساری انسانیت کے لیے بہترین پیغام ہے۔

کیا کوئی جنون والا آدمی ایسی کتاب لا سکتا ہے جس میں اتنی اعلیٰ تعلیمات درج ہوں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ نے ہجو اور استہزار کے مواقع پر یا تو صبر کیا، یا دلیل کی زبان میں ان کا رد کیا۔

آپ قاتلِ عالم نہیں تھے بلکہ رحمتِ عالم تھے۔ اور رحمتِ عالم وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوگوں کی ایذا رسانی کے باوجود انہیں معاف کرے، جو لوگوں کی طرف سے اشتعال انگیز سلوک کے باوجود ان کے لیے رحمت کا پیکر بنا رہے۔ آپ کی یہی بلند کرداری ہے جس کی شہادت قرآن میں ان لفظوں میں دی گئی ہے: انک لعلیٰ خلقٍ عظیم بے شک تم بلند اخلاق پر ہو

دعوتی تصویر

اسلام ایک دعوت ہے نہ کہ محض ایک تعزیری قانون۔ اسلام کی اوّلین دلچسپی خدا کے بندوں

کو خدا کا پرستار بنانا ہے نہ کہ انہیں مجرم قرار دے کر انہیں کوڑا مارنا اور گولی اور پھانسی کا نشانہ بنانا۔ تعزیری قانون کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ لوگ اس کے بارہ میں کیا رائے قائم کریں گے۔ مگر دعوت کا مزاج اس کے بالکل برعکس ہے۔ داعی لوگوں کو ختم کرنے کے بجائے لوگوں کو اپنے اندر ضم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے داعی ایسا نہیں کرتا کہ لوگوں کے خلاف اندھا دھند سزائیں جاری کرنا شروع کر دے۔ وہ یک طرفہ طور پر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسان کے "حال" سے زیادہ انسان کے "مستقبل" پر نظر رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو معاف کرتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر اس کے بارہ میں نرم گوشہ پیدا ہو، وہ لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا انداز اختیار کرتا ہے تاکہ جو لوگ آج اس کے ہجو گو ہیں، کل وہ اس کے مدح خواں بن جائیں۔ جو لوگ ابھی اس کے ساتھی نہیں بنے، آئندہ وہ اس کے شریک اور ساتھی بن جائیں۔ داعی کا کام غیر کو اپنا بنانا ہے، نہ کہ جو غیر دکھائی دے اس کا دشمن بن کر صرف اس کی ہلاکت کے درپے ہو جانا۔

بدنامی سے بچت

کسی کارخانہ کی خوش نامی اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام کی اشاعت کے لیے اس کی دعوتی تصویر بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام میں یہ بات آخری حد تک مطلوب ہے کہ اسلام کی دعوتی تصویر کو بگڑنے سے بچایا جائے۔ اسلام کی دعوتی تصویر کی حفاظت ہر دوسری چیز پر مقدم ہے، حتیٰ کہ توہین رسول اور اہانت اسلام جیسے جذباتی مواقع پر بھی۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے یہاں عبد اللہ بن ابی بن سلول کی مثال درج کی جاتی ہے۔ یہ شخص مدینہ کے قبیلۂ خزرج کا سردار تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر مدینہ کے لوگوں نے اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہا۔ اس کے لیے ایک تاج کی تیاری بھی شروع ہو گئی ـــــ عین اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ یہاں آتے ہی لوگوں نے آپ کو اپنا بڑا بنا لیا۔ عبد اللہ بن ابی کو اس سے بہت تکلیف پہنچی۔ حالات کے دباؤ کے تحت اس نے رسول اللہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ تاہم اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے ساری عمر آپ کی توہین و تحقیر کرتا رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز حضرت سعد بن عبادہ کی عیادت کے لیے نکلے۔ آپ

ایک گدھے پر سوار تھے۔ راستہ میں عبداللہ بن ابی کا قلعہ نما مکان آیا جس کا نام مزاحم تھا۔ اس وقت عبداللہ بن ابی کے گرد اس کے قبیلہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ وہاں سواری سے اتر پڑے اور عبداللہ بن ابی کے پاس پہنچ کر اس کو سلام کیا۔ آپ تھوڑی دیر وہاں بیٹھے اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔

راوی (اسامہ بن زید بن حارثہ) کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی بے پروائی کے ساتھ چپ چاپ سنتا رہا۔ جب آپ فارغ ہو چکے تو عبداللہ بن ابی نے کہا: اے شخص، آپ کی یہ بات تو اچھی ہے، لیکن اگر وہ حق ہے تو آپ اپنے گھر میں بیٹھیں اور جو شخص اس کو سننے کے لیے آپ کے پاس آئے اس کو سنائیں، اور جو شخص آپ کے پاس نہ آئے تو اس کو آپ اس کی تکلیف نہ دیں۔ اور ایسے شخص کی مجلس میں اس کا ذکر نہ کریں جو اس کو ناپسند کرتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ بن ابی کا یہ قول سخت ناگوار ہوا مگر آپ خاموشی سے آگے بڑھ گئے (سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۱۹)

غزوۂ احد (شوال ۳ھ) میں قریش کا لشکر مکہ سے چل کر مدینہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ فرمایا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ دوسرے لوگوں نے کہا کہ شہر کے اندر ٹھہر کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی نے یہی دوسری رائے پیش کی۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے گروہ کی رائے کا لحاظ فرمایا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

جب آپ مدینہ اور احد کے درمیان پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر اسلامی فوج سے الگ ہو گیا۔ اس طرح اس نے بے حد نازک موقع پر سخت بے وفائی کا ثبوت دیا۔ مزید یہ کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی بھی کی۔ اس نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا کہ اس شخص نے دوسروں کی بات مانی اور میری بات نہیں مانی۔ لوگو، میں نہیں سمجھتا کہ ہم یہاں کس لیے اپنے آپ کو ہلاک کریں (اطاعہم وعصانی، ماندری علام نقتل انفسنا ھٰھنا ایہا الناس) (سیرت ابن ہشام، الجزء الثالث، صفحہ ۸)

غزوۂ بنی المصطلق شعبان ۶ھ میں ہوا۔ اس مہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبداللہ بن ابی بھی تھا۔ سفر سے واپسی میں ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قافلہ نے ایک

مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ صبح کو اندھیرے میں روانگی ہوئی۔ اس وقت ایک اتفاقی غلطی سے حضرت عائشہ، جو آپ کے ساتھ شریکِ سفر تھیں، قافلہ سے پیچھے رہ گئیں۔ سورج نکلنے کے بعد ایک صحابی صفوان بن معطّل سُلمی اس جگہ سے گزرے۔ انہوں نے حضرت عائشہ کو اپنے اونٹ پر بٹھالیا اور خود اس کی نکیل پکڑ کر آگے چلتے ہوئے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا۔ اس واقعہ کو عبداللہ بن ابی نے خوب استعمال کیا۔ حضرت عائشہ کا اس طرح تنہا ایک نوجوان کے ساتھ آنا ایک ہنگامی سبب سے تھا۔ مگر عبداللہ بن ابی نے اس کو برے معنی پہنا کر خوب تقریریں کیں۔ اس نے اس واقعہ کو پیغمبر کی کردار کشی کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ پورے مدینہ میں آپ کے خلاف شک وشبہ کی فضا پیدا ہوگئی۔

اس واقعہ کی تفصیلات سیرت اور تفسیر کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ جس شخص نے اس بہتان تراشی میں سب سے بڑا حصہ ادا کیا اس کے لیے عذابِ عظیم ہے (النور ۱۱) اس آیت میں جس شخص کے لیے سب سے بڑے عذاب کا ذکر ہے، اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے۔ مگر اس کو دنیا میں کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس کے معاملہ کو تمام تر آخرت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مرا۔

غزوۂ بنی المصطلق (۵ ھ) سے واپسی میں ایسا ہوا کہ پانی کے ایک چشمہ پر پانی لینے کے لیے مسلمانوں کا ہجوم ہوگیا۔ اس وقت ایک مہاجر اور ایک انصاری آپس میں لڑ گئے۔ مہاجر نے کہا: یا للمہاجرین، انصاری نے کہا: یا للانصار۔ یہاں تک کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداخلت فرما کر اس کو ختم کیا۔

عبداللہ بن ابی پہلے سے اس بات پر خوش نہ تھا کہ مکہ کے مسلمانوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ بلا کر انہیں یہاں پناہ دی جائے۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے قبیلہ والوں کے سامنے اشتعال انگیز تقریر کی۔ اس میں اس نے کہا کہ اپنے کتے کو پال کر موٹا کرو کہ وہ تمہیں کو کاٹ کھائے۔ خدا کی قسم، اگر ہم مدینہ واپس پہنچ گئے تو عزت والا ذلت والے کو وہاں سے نکال دے گا۔

عبداللہ بن ابی کی یہ باتیں سن کر صحابہ کو غصہ آگیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول،

مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (دعہ لایتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابہ) تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، صفحہ ۳۷۰)

مزید مثالیں

اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لیث بن سعد نے یحییٰ بن سعید سے، انھوں نے ابوالزبیر سے روایت کی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے کہا کہ جعرانہ میں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو عطیات دے رہے تھے۔ آدمی نے دیکھ کر کہا کہ اے محمد، انصاف کیجئے (یامحمد اعدل) آپ نے فرمایا، تمہارا برا ہو، اگر میں انصاف نہ کروں تو اور کون انصاف کرے گا۔

حضرت عمرؓ نے یہ گفتگو سن کر کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کر دوں، آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ کہ لوگ یہ کہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔ (معاذاللہ ان یتحدث الناس انی اقتل اصحابی) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۶۸۷

غزوۂ تبوک کی واپسی میں کچھ منافق قسم کے مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ مخلص مسلمانوں سے الگ ہو کر بیٹھتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بے ہودہ باتیں کیا کرتے۔ حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کہ جانتے ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ لوگ بیٹھ کر آپس میں ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت حذیفہ نے کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے کہ ہم انھیں قتل کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ناپسند ہے کہ لوگ یہ چرچا کریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (اکرہ ان یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابہ) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الرابع، صفحہ ۳۵۔

زیادہ قابلِ لحاظ

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کی اور آپ کے خلاف سب وشتم والے افعال

کیے۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام کو وہ قابلِ قتل نظر آنے لگے۔ انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر اجازت دیں تو وہ انہیں قتل کر دیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل کی اجازت نہ دی۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اگر میں ان کو قتل کر دوں تو لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کو اسلام کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کریں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز ہے جو "قتل شاتم" سے بھی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ اور وہ اسلام کی دین رحمت کی تصویر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں دعوتی تصویر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی دعوتی تصویر بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک شخص کے کھلے ہوئے سب وشتم اور اس کی شدید ایذا رسانی کے باوجود اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو نظر انداز کر کے چھوڑ دیا جائے گا۔

اسلام میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ چیز دعوتی مصلحت ہے۔ دعوتی مصلحت اسلام میں سپریم حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔ دعوتی مصلحت کی خاطر ہر دوسری چیز کو نظر انداز کر دیا جائے گا، خواہ وہ بجائے خود کتنی ہی زیادہ سنگین نظر آتی ہو۔ مسلمانوں کے دلوں کا مجروح ہونا خدا اور رسول کی نظر میں اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ دعوتی مصلحت کا مجروح ہونا۔ اگر کسی معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں تو انہیں اپنے جذبات کو دبانا چاہیے، نہ کہ وہ جذبات کا بے جا اظہار کریں اور دعوت کے قیمتی مصالح کو برباد کر کے رکھ دیں۔

اغیار کو موقع نہ دینا

مذکورہ واقعات میں جن افراد کا ذکر ہے، ان کی توہین رسول اور اسلام دشمنی بالکل واضح تھی۔ اپنے کردار کے اعتبار سے بلاشبہ وہ لوگ اس کے مستحق بن چکے تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اسی بنا پر صحابہ کرام نے ان کو اعداء اللہ قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ اجازت دیجیے کہ ہم خدا اور رسول کے ان دشمنوں کو قتل کر کے ان کا خاتمہ کر دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان اشخاص کو قتل کرتے تو اس کی وجہ یقیناً ان کی اسلام دشمنی ہوتی۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں جہاں ہر ایک کو آزادی ہے، آپ کسی کو اس پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ وہی الفاظ بولے جو آپ چاہتے ہیں کہ بولا جائے۔ چنانچہ یہ یقینی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر صرف ان کے شتم کو دیکھا اور شتم کی سزا کے بعد پیدا ہونے والے نتائج کو نہیں دیکھا اور ان

افراد کو قتل کرا دیا تو اس کے بعد ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ اصل واقعہ کے مطابق صرف یہ کہیں کہ "محمد نے اسلام دشمنوں کو قتل کیا ہے"۔ اس کے برعکس یقینی تھا کہ وہ یہ کہیں گے کہ "محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں"۔ ان برے لوگوں کا قتل بجائے خود ایک صحیح فعل تھا۔ مگر حالات کے اعتبار سے یقینی تھا کہ صحیح ہونے کے باوجود وہ عوام کے درمیان اسلام کی بدنامی کا سبب بن جائے گا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل نہیں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ نہ تھا کہ پہلے قتل کر دیں۔ اور پھر جب لوگ بدنام کریں تو اس کے بعد یہ شکایت کریں کہ لوگ ہم کو غلط طور پر بدنام کرتے ہیں۔ اس کے بجائے آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ایسا فعل ہی نہ کیا جائے جس کی وجہ سے لوگوں کو غلط طور پر بدنام کرنے کا موقع ملے۔ اس معاملہ میں یہی حکمتِ نبوی ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال آج ہمارے سامنے ہے۔ سلمان رشدی نے بلاشبہ توہینِ رسول اور اسلام دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ سخت سزا کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان اگر اس کے خلاف قاتلانہ کارروائی کریں تو ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ لوگ یہ کہیں کہ مسلمانوں نے ایک اسلام دشمن کو قتل کر دیا۔ بلکہ لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ لوگ یہ کہنے لگیں گے کہ مسلمان آزادئ فکر کے قاتل ہیں۔ اسلام کا اصل انحصار تلوار کی طاقت پر ہے نہ کہ دلیل کی طاقت پر۔

ہمیں اس حقیقت کو جاننا چاہیے کہ موجودہ زمانہ آزادئ فکر کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادئ فکر کو سب سے بڑی قدر کا درجہ دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں آزادی خیر اعلیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج کا انسان کسی ایسے مذہب یا نظام کو غیر مہذب اور وحشیانہ سمجھتا ہے جو آزادئ فکر کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں، باعتبار نتیجہ، سب سے بڑی اسلام دشمنی یہ ہوگی کہ کوئی ایسا عمل کیا جائے جو دنیا والوں کو یہ کہنے کا موقع دے کہ اسلام آزادئ فکر کا قاتل ہے، اور اس لیے وہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔ اس معاملہ میں سنتِ رسول کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کو اس "بدنامی" سے بچایا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی ہو، خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی چیز کو برداشت کرنا پڑے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام دشمنوں کو قتل نہیں کیا تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ کھلے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اسلام دشمنوں کو قتل کرنے کے لیے سرگرم ہیں تاکہ لوگوں کے درمیان اسلام کی دعوت کا دروازہ بند ہو جائے، اس قسم کی سرگرمی بلاشبہ سرکشی ہے، اس کا

خدا و رسول کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔

دو اقتباس

سلمان رشدی کے خلاف مسلمانوں کے مجنونانہ ایجی ٹیشن کا فائدہ تو کچھ نہیں ہوا۔ البتہ اس کا یہ زبردست نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو کر رہ گیا۔ اس کی بے شمار مثالیں ۱۹۸۹ کے نصف اوّل میں سامنے آئی ہیں۔ یہاں مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان میں سے دو مثال نقل کی جاتی ہے۔

"لندن کے مضافات میں مقیم ایک برطانوی نژاد نومسلم انگریز نے، جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے، لکھنؤ میں مقیم اپنے ایک دوست کو لکھا ہے کہ مجھے اپنے خاندان، رشتہ داروں، اپنے دوستوں اور اپنی پوری قوم کا رویہ ایک دم بدلا ہوا نظر آرہا ہے۔ چاروں طرف سے لوگ حملے کر رہے ہیں۔ حملے کس رہے ہیں، اور خمینی کا نام لے کر چڑھا رہے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انگریز قوم کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے اسلام سے اتنی سخت نفرت پیدا ہو جائے گی۔ اس واقعہ سے پہلے جو چند ماہ میں نے اسلام لانے کے بعد یہاں گزارے تھے، ان کے دوران مجھے ایسی تلخی کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔"

ماخوذ از: ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، اپریل ۱۹۸۹، صفحہ ۴-۵

۲۔ ٹائم میگزین (۱۷ اپریل ۱۹۸۹) کے دو صفحہ پر یورپ میں اسلام کے بارہ میں ایک باتصویر رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کا ایک پیرگراف یہ ہے:

The incendiary furor over Salman Rushdie and his novel *The Satanic Verses* seemed to confirm the long-standing Western stereotype of Islam as a religion of intolerance and violence. The clash in Europe was especially acute. Almost overnight, efforts to erase old perceptions were "demolished," says French historian Bruno Etienne, a scholar of Islam. "I would have preferred that instead of the screaming thousands brought to us by TV, we could have seen the hundreds of thousands of Muslims who reflect and who pray in private for an integrated Islam."

شور وغل مغرب کے اس قدیم نظریہ کی تصدیق کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ اسلام غیر رواداری اور تشدّد پسندی کا مذہب ہے ۔ یورپ میں ٹکراؤ خاص طور پر بہت سخت تھا۔ تقریباً راتوں رات ایسا ہوا کہ قدیم تصوّرات کو مٹانے کی کوششیں ملیامیٹ ہو کر رہ گئیں۔ ایک فرانسیسی مورّخ برونو ایٹنی جو اسلام کا عالم ہے، اس نے کہا کہ ہزاروں لوگ جو ہم کو ٹی وی کے اوپر چیختے چلاّتے ہوئے دکھائے گئے، اس کے مقابلہ میں مجھ کو یہ زیادہ پسند تھا کہ ہم ایسے ہزاروں مسلمان دیکھتے جو اپنی تنہائیوں میں اسلام کے استحکام کے لیے دعائیں کر رہے ہوتے۔ (صفحہ ۴۰)

ان دو حوالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے رشدی کے خلاف جو بے معنی شور وغل کیا، وہ کس طرح کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہونچا، البتہ وہ اسلام کی بدنامی کا سبب ضرور بن گیا۔

دورِ اوّل کی مثال

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام خیال یہ ہو گیا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی یا اس کا استہزار ایک ایسا جرم ہے جو علی الاطلاق طور پر مجرم کو واجب القتل بنا دیتا ہے۔ یعنی جیسے ہی کوئی شخص ایسے الفاظ بولے جو مسلمانوں کو رسول اللہ کی شان میں گستاخی نظر آئے، اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔ اس قسم کا مطلق نظریہ شرعی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اسلام میں اس کے لیے کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے ساتھ استہزار کا معاملہ کوئی اتفاقی نہیں۔ یہ مجرمانہ فعل بلا استثنار خدا کے تمام پیغمبروں کے ساتھ ہمیشہ جاری رہا ہے (الحجر ۱۱، الزخرف ۷) قرآن میں تقریباً ۵۰ مقامات پر بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کے معاصرین نے پیغمبروں کا استہزار اور تمسخر کیا۔ انھوں نے ان کی شان میں گستاخیاں کیں۔ مگر ایک جگہ بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جہاں بھی کوئی شخص پیغمبر کا مذاق اڑائے، فوراً اس کو قتل کر دو۔ ایسے کسی شخص کو ہرگز زندہ نہ چھوڑو۔

قرآن میں استہزار کے جرم کا ذکر تو بار بار آیا ہے مگر اس کے مجرم کے لیے سزائے قتل کا اعلان سارے قرآن میں کہیں بھی موجود نہیں۔ قرآن میں مستہزئین رسالت کے سلسلہ میں صرف دو قسم کے ردِ عمل کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یا تو دلائل کے ساتھ ان کی کہی ہوئی بات کو رد کیا گیا ہے، یا انہیں خدا کی پکڑ سے اور اس کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔

یہ استہزار کرنے والے غیر مسلمین بھی ہوتے تھے (یٰس ۳۰) اور منافق قسم کے مسلمان بھی (البقرہ ۱۴، التوبہ ۶۵) پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دونوں قسم کے لوگوں کی طرف سے یہ معاملہ اپنی بدترین صورت میں پیش آیا۔ مگر مجرد استہزار کی بنا پر قرآن میں نہ غیر مسلموں کے لیے قتل کی قانونی سزا کا حکم دیا گیا اور نہ منافق مسلمانوں کے لیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر رسول کی اہانت اور آپ کے ساتھ گستاخی کو اس طرح مطلق انداز میں واجب القتل جرم قرار دے دیا جاتا تو یہ مجرم سے زیادہ خود اسلام کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان

کا باعث بن جاتا۔ کیونکہ اسلام کے وہ مقدس سپاہی جن کو صحابۂ کرام کہا جاتا ہے، ان کی بیشتر تعداد ابتداءً عین اسی جرم میں مبتلا تھی جس کو "رسول کی شان میں گستاخی" کہا جاتا ہے۔ اگر اس جرم کا ارتکاب کرتے ہی فوراً انہیں قتل کر دیا جاتا تو یہ سادہ معنوں میں صرف مجرم کا قتل نہ ہوتا بلکہ تاریخ ساز انسانوں کا قتل ہوتا۔ اس کے بعد اسلام کی وہ تاریخ ہی نہ بنتی جو بعد کو بنی، اور جو موجودہ مسلمانوں کا سب سے زیادہ پُرفخر سرمایہ ہے۔ تمام قیمتی زندگیاں اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتیں کہ وہ اسلام قبول کریں اور دنیا کی تاریخ میں وہ عظیم الشان کردار ادا کریں جو منصوبۂ الٰہی کے تحت ان کے لیے عالمی سطح پر مقدر کیا گیا تھا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کچھ واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ واقعات بطور حصر نہیں ہیں، بلکہ صرف بطور مثال ہیں۔ پہلے کچھ غیر مسلموں کے واقعات درج کیے جائیں گے، اور اس کے بعد کچھ مسلمانوں کے واقعات۔

مستقبل پر نظر

قدیم مکہ میں جو ممتاز افراد تھے، ان میں سے ایک شخص کا نام سہیل بن عمرو تھا۔ آج سہیل بن عمرو کا شمار صحابہ کی فہرست میں ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ وہ بدر کی لڑائی میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے۔ اس لڑائی میں رسول اللہ ؐ کے مقابلہ میں مشرکین کو شکست ہوئی۔ ان کے ۷۰ آدمی گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ ان میں سے ایک سہیل بن عمرو بھی تھے۔

سہیل بن عمرو کے اندر زبان آوری کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ خطیبِ قریش کہے جاتے تھے۔ اپنی اس صلاحیت کو انھوں نے بھرپور طور پر اسلام کے خلاف استعمال کیا۔ وہ شعر اور خطابت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور آپ کے خلاف اور اسلام کے خلاف لوگوں کو اکساتے رہتے تھے۔ جب وہ گرفتار ہو کر مدینہ آئے اور ان کے اوپر مسلمانوں کو پوری طرح قابو حاصل ہو گیا، تو حضرت عمر فاروق ؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے خدا کے رسول، مجھے اجازت دیجئے کہ میں سہیل بن عمرو کے سامنے کے دانت توڑ دوں۔ اس طرح اس کی زبان باہر نکل پڑے گی اور اس کی آواز خراب ہو جائے گی۔

اس کے بعد وہ اس قابل نہ رہے گا کہ آپ کے خلاف خطیب بن کر کھڑا ہو سکے۔

بظاہر یہ ایک جائز بات تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں اس کا مُثلہ نہیں کروں گا۔ اگر میں اس کا مُثلہ کر دوں تو اللہ میرا مُثلہ کرے گا، اگرچہ میں ایک رسول ہوں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے مزید ایک بات فرمائی۔ یہ بات بظاہر شخصی ہے مگر وہ ایک عالمی انسانی حقیقت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ سہیل بن عمرو ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں تم ان کی مذمت نہ کر سکو۔ (انہ عسیٰ ان یقوم مقاماً لا تذمہ) سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۹۳) چنانچہ مُثلہ یا قتل کے بغیر سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غیر معمولی سلوک کیا کہ غزوۂ بدر (۲ھ) کے بعد ان پر قابو پانے کے باوجود انہیں رہا کر دیا۔ مگر اب بھی وہ اپنی اسلام دشمنی سے باز نہ آئے۔ انھوں نے مکّہ کے لوگوں کو دوبارہ اکسایا اور تین ہزار کی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ اندوہناک جنگ پیش آئی جس کو غزوۂ احد (۳ھ) کہا جاتا ہے۔

یہی سہیل بن عمرو تھے جنھوں نے معاہدہ حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر لفظ رسولؐ کو کاغذ سے محو کرایا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کی یک طرفہ شرائط پر راضی ہونے کے لیے مجبور کیا تھا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد فرمائی۔ ۸ھ میں مکّہ فتح ہو گیا۔ اس وقت تک سہیل بن عمرو کفر کی حالت میں تھے۔ مگر اب بھی، ثابت شدہ جرائم کے باوجود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی سزا نہیں دی۔ اس کے برعکس آپ نے اپنے اصحاب کو ان کے ساتھ حسن اخلاق کی ہدایت فرمائی۔ آپ نے کہا:

من لقی سہیل بن عمرو فلا یحد الیہ	جو شخص سہیل بن عمرو سے ملے، وہ اس کی
النظر۔ فلعمری ان سہیلاً لہ عقل	طرف تیز نگاہوں سے نہ دیکھے۔ میری جان کی قسم،
وشرف وما مثل سہیل یجھل الاسلام	بلاشبہ سہیل عقل اور شرف والا آدمی ہے۔

(سیرۃ حلبیہ، جلد ۲، صفحہ ۲۲۶)　　اور سہیل جیسا آدمی اسلام سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

سہیل بن عمرو کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایتیں جاری رہیں۔ غزوۂ ہوازن کے بعد آپ نے ان کو ایک سو اونٹ تالیف قلب کے طور پر دیے۔ اس عطیہ کے بعد وہ بالکل ڈھ پڑے اور اسلام قبول کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بن گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں یہ تاثر پھیل گیا کہ وہ شخص دُنیا سے چلا گیا جس کی وجہ سے اسلام کو خدا کی مدد ملتی تھی۔ چنانچہ عرب قبائل کی اکثریت ارتداد کی طرف مائل ہوگئی۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو مکہ کے بیشتر لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ اسلام سے پھر جائیں۔ انھوں نے اس کا پورا ارادہ کر لیا۔ مکہ کی فضا اتنی خراب ہوئی کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عامل عتاب بن اُسید روپوش ہو گئے۔

مذکورہ سہیل بن عمرو اس وقت تک اسلامی جماعت کے ایک فرد بن چکے تھے۔ وہ شاندار خطیب ہونے کے ساتھ ایک بارعب شخصیت والے آدمی تھے۔ جب انھوں نے مکہ کا یہ حال دیکھا تو وہ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی اعلیٰ خطیبانہ صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان ایک پُرزور تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ سن لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نے اس کے سوا کچھ اور نہیں کیا ہے کہ اس نے اسلام کی قوت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ جو شخص ہمارے خلاف کچھ کرے گا، ہم تلوار سے اس کی گردن مار دیں گے۔

سہیل بن عمرو کی گرج دار تقریر کو سن کر لوگوں نے رجوع کر لیا۔ انہوں نے اسلام سے پھرنے کا جو ارادہ کیا تھا، اس سے باز آ گئے۔ اس کے بعد عتاب بن اسید بھی روپوشی سے نکل آئے۔ راوی کہتے ہیں کہ یہی مطلب تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن وہ ایسے مقام پر کھڑے ہوں جہاں وہ تمہارے نزدیک قابلِ مذمت نہ ہوں بلکہ قابلِ تعریف ہوں۔　　(سیرت ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۳۴۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنّت بتاتی ہے کہ آپ کی نظر حال پر نہیں رکتی تھی۔

آپ آدمی کے حال سے گذر کر اس کے مستقبل کے امکانات کو دیکھتے تھے۔ ایک انسان کا آج اگر باغیانہ ہے تو اس کو نظر انداز کر کے آپ یہ سوچتے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں وہ ہمارا وفادار ہو جائے۔ اور پھر اس کی وہ خداداد صلاحیتیں جو اس وقت اسلام کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں، وہ اسلام کی تائید میں استعمال ہونے لگیں ـــــ تاریخ بتاتی ہے کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔

اگلی نسلوں تک انتظار

اسلامی تاریخ میں ۱۰ نبوی کو عام الحزن کہا جاتا ہے، کیونکہ اسی سال اوّلاً ابوطالب اور اس کے بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ کے حالات انتہائی حد تک غیر موافق ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے اسی سال مکہ سے طائف کا سفر کیا۔ یہ سفر اس امید میں تھا کہ شاید طائف میں آپ کے لیے کام کے موافق حالات مل سکیں۔

مگر عملاً اس کے برعکس ہوا۔ طائف کے سرداروں (عبد یالیل، مسعود، حبیب) نے آپ کے ساتھ بے حد گستاخی اور اہانت کا سلوک کیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے شہر کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جو آپ کی ہنسی اڑائیں اور آپ پر پتھر برسائیں۔ آپ اس حال میں طائف سے واپس ہوئے کہ پتھروں کی مار سے آپ کا جسم خوں آلود ہو گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت دن وہ ہے جو طائف کے سفر کے موقع پر گزرا۔

صحیح بخاری (باب ذکر الملائکۃ) میں ہے کہ جب آپ طائف سے زخم خوردہ اور غم گین حالت میں واپس لوٹ رہے تھے تو قرن ثعالب کے مقام پر حضرت جبریلؑ آپ کے پاس آئے انھوں نے آپ کو آواز دے کر کہا کہ اللہ نے آپ کی قوم کے سلوک کو دیکھا۔ اب اللہ نے ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتہ) کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ اہل طائف کے بارہ میں جو کچھ چاہتے ہیں، اس کا انہیں حکم دیں۔

اس کے بعد ملک الجبال (پہاڑوں کا فرشتہ) سامنے آیا۔ اس نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ اے محمدؐ، اللہ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اللہ نے آپ کے خلاف آپ کی قوم کی بات سنی۔

میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو باہم ملا کر اس کے درمیان طائف کی بستی کو پیس ڈالوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں سے وہ انسان پیدا کرے گا جو ایک اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے۔ (ارجوان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبداللہ لا یشرک بہ شیئا)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اگر موجودہ نسل نہ مان رہی ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی اگلی نسلوں تک انتظار کرنے کے لیے تیار تھے۔ موجودہ لوگوں کی طرف سے توہین اور سرکشی کا تجربہ ہونے کے باوجود آپؐ اس امید میں انھیں ہلاک کرنا پسند نہیں کرتے تھے کہ شاید ان کی اولاد یا اولاد کی اولاد میں وہ انسان پیدا ہو جو خدا کی خدائی کا اعتراف کرے اور اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد کے دور میں طائف کے تمام باشندے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام کی راہ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ مثلاً ابوعبید مسعود ثقفی انہیں اہل طائف کی اولاد تھے۔ وہ اس مسلم فوج کے قائد تھے جس نے حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانہ میں ایران میں جہاد کیا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی فوج کے مقابلہ میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر ایرانی فوجوں کو اس قدر مرعوب کیا کہ انہوں نے جنگ کا حوصلہ کھو دیا۔

محمد بن القاسم ثقفی ۶۷۱ (۹۵ھ) میں سندھ کے راستہ سے ہندستان میں داخل ہوا۔ وہ ایک انتہائی عادل اور باصلاحیت سردار تھا۔ اس نے صرف دو سال کے عرصہ میں سندھ اور پنجاب میں اتنے بڑے پیمانے پر اسلام کی اشاعت کی کہ ایک پورا علاقہ اللہ کے دین کے سایہ میں آگیا۔ موجودہ پاکستان محمد علی جناح کی دین نہیں بلکہ حقیقتہً وہ محمد بن القاسم ثقفی کی دین ہے۔

محمد بن القاسم اتنا لائق اور شریف سردار تھا کہ جب وہ ہندوستان سے واپس ہو کر دمشق گیا تو، فتوح البلدان کے بیان کے مطابق، اہل ہند اس کے لیے روئے اور اس کا مجسمہ

بنا کر اس کی تعظیم و تقدیس کی (فبکیٰ اھل الھند وصوردہ) اسلام کا یہ قیمتی مجاہد اسی قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا جس کی بدترین گستاخی اور ایذا رسانی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی اگلی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کے عبادت گذار بنیں گے۔

قبیلۂ ثقیف (اہل طائف) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی اور ایذا رسانی کا بدترین فعل کیا تھا۔ مزید یہ کہ ان کو سزا دینے کا معاملہ پوری طرح آپ کے قابو میں تھا، کیونکہ پہاڑوں کا فرشتہ (ملک الجبال) آپ کے حکم کے نفاذ کے لیے آچکا تھا۔ مگر آپ نے انہیں سزا دینے کے بجائے اس کو پسند کیا کہ ان کی نسلوں سے ایسے افراد نکلیں جو اسلام کے سپاہی بن کر اسلام کی تاریخ بنائیں۔

حالات بتاتے ہیں کہ فی الواقع ایسا ہی پیش آیا۔ اگر آپ طائف والوں کی گستاخی کی سزا دینے کے لیے ملک الجبال کو استعمال کرتے تو طائف آج صرف کھنڈروں کی داستان ہوتا، نہ کہ اسلام کے قلعہ کی تعمیر کی شاندار تاریخ۔

آج کا دشمن کل کا دوست

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی مخالفین میں سب سے بڑا کردار جس شخص نے ادا کیا، وہ مکہ کا عمرو بن ہشام ہے جو تاریخ میں ابوجہل کے نام سے مشہور ہے۔ ابوجہل کے لڑکے کا نام عکرمہ تھا۔ عکرمہ آج اصحاب رسول کی معزز فہرست میں شامل ہیں، مگر فتح مکہ سے پہلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت مخالف تھے اور اس معاملہ میں پوری طرح اپنے باپ کے ساتھ تھے۔ گستاخی اور جارحیت کی کوئی قسم نہ تھی جو انھوں نے آپ کے خلاف اختیار نہ کی ہو۔ حتیٰ کہ اپنے باپ کی موت کے بعد بھی وہ بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سرگرم رہے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مشرک فوج کے میمنہ کے سردار خالد بن ولید تھے، اور میسرہ کے سردار عکرمہ بن ابی جہل۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف عکرمہ کا جرم اتنا واضح تھا کہ فتح مکہ کے بعد وہ مکہ کو چھوڑ کر یمن کی طرف بھاگ گئے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔

ان کی بیوی جو مسلمان ہوگئی تھیں، وہ یمن جاکر باصرار انہیں واپس لے آئیں۔ وہ انتہائی شرمساری کے ساتھ اپنا سر جھکائے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا مجھے امان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، تم کو امان ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر کار انھوں نے کلمہ شہادت ادا کر کے اسلام قبول کر لیا۔

عکرمہ جب یمن سے واپس ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آرہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ عکرمہ تمہارے پاس آرہے ہیں۔ تم ان کے باپ (ابوجہل) کو برا نہ کہنا۔ کیونکہ مُردہ کو بُرا کہنا مُردہ تک تو نہیں پہنچتا، البتہ وہ زندہ کو تکلیف دیتا ہے۔ عکرمہ جب آپ کے پاس پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوش ہوکر ان کی طرف تیزی سے بڑھے، حتیٰ کہ آپ کی چادر آپ کے اوپر سے گر پڑی۔

اسلام قبول کرنے کے بعد عکرمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں آپ سے ایک چیز طلب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تم طلب کرو میں تمہیں ضرور وہ چیز دوں گا۔ عکرمہ نے کہا کہ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ ہر دشمنی جو میں نے آپ کے ساتھ کی ہے، یا ہر رُکاوٹ جو میں نے آپ کے راستہ میں ڈالی ہے، ہر وہ لڑائی جو میں نے آپ کے خلاف لڑی ہے، ہر وہ بدکلامی جو میں نے آپ کے منہ پر کی ہے یا آپ کے پس پشت کی ہے، ان سب کو آپ معاف کر دیں اور ان کے بارے میں اللہ سے میرے لیے استغفار فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ہی ان کے حق میں یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ ہر وہ عداوت جو عکرمہ نے میرے ساتھ کی، ہر وہ سرگرمی جو انھوں نے اس ارادہ سے کی کہ تیرے نور کو بجھا دیں، ان سب کو تو ان کے لیے معاف کر دے اور وہ سب کچھ جو انھوں نے میری بے آبروئی کے لیے کیا، خواہ میرے سامنے کیا ہو، یا میرے پس پشت، ان سب کو تو ان سے معاف کر دے۔

اس کے بعد عکرمہ نے کہا کہ اے رسول اللہ، خدا کی قسم، ہر وہ خرچ جو میں اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کرتا تھا، اب میں اس کا دُگنا اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اور اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جو جنگیں میں نے کیں، اب اللہ کے راستہ میں اس سے

دُگنا جنگ کروں گا۔ چنانچہ اس کے بعد عکرمہ اپنی جان اور اپنے مال کیساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں لگ گئے۔ وہ برابر اسی میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ وہ یرموک کے معرکہ میں زبردست جانبازی دکھاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (حیاۃ الصحابہ طبع دمشق، الجزء الاول، صفحہ ۷۷۔۱۷۶)

عکرمہ نے گستاخی سے لے کر جارحیت تک ہر جرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیا تھا۔ بظاہر وہ صرف اس قابل تھے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاتل نہیں تھے، داعی تھے۔ آپ نے عکرمہ کے "آج" میں ایک چھپا ہوا "کل" دیکھ لیا تھا۔ یہی وہ داعیانہ نگاہ تھی جس کی بنا پر آپ نے انہیں یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ بعد کے واقعات نے بتایا کہ آپ کا اندازہ نہایت درست تھا۔ چنانچہ دشمن عکرمہ کے اندر سے ایک دوست عکرمہ برآمد ہوا۔ جو شخص اپنی ابتدائی زندگی میں کفر کا کھمبا بنا ہوا تھا، وہ اپنی بعد کی زندگی میں اسلام کا ستون بن گیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد

اوپر ان لوگوں کی مثال نقل کی گئی ہے جو قبولِ اسلام سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہوئے مگر انھیں سزا دینے کی بجائے ان کو معاف کر دیا گیا۔ اب کچھ ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جب کہ آدمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کی شان میں گستاخی کی اور آپ کو اذیت پہنچائی۔ اس کے باوجود اس مسلمان کو قتل کی سزا نہیں دی گئی۔

۱۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ، مجھ سے ابو عبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر نے مقسم بن ابو القاسم مولیٰ عبد اللہ بن الحرث بن نوفل کی روایت بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ میں اور تلید بن کلاب اللیثی دونوں نکلے، یہاں تک کہ ہم عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ وہ اپنا جوتا ہاتھ میں لٹکائے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا۔ کیا آپ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے جب حنین کے دن تمیمی نے آپ سے بات کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ بنو تمیم کا ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس کو ذو الخویصرہ کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس وقت آپ لوگوں کو مالِ غنیمت دے رہے تھے۔ (وہ دیکھتا رہا) یہاں تک کہ اس نے کہا کہ اے محمدؐ، میں نے اس کو دیکھ لیا جو آپ نے آج کیا ہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، پھر تم نے کیا دیکھا۔ اس نے کہا میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے عدل کیا ہو (لم أرك عدلت)

عبداللہ بن عمرو بن العاص نے بیان کیا کہ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو گئے۔ آپ نے کہا کہ تیرا برا ہو، اگر میرے پاس عدل نہیں ہو گا تو پھر کس کے پاس عدل ہو گا۔

حضرت عمر بن الخطاب نے یہ سن کر کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، کیا میں اسے قتل نہ کر دوں۔ آپ نے کہا کہ نہیں، اس کو چھوڑ دو۔ عنقریب اس کی ایک جماعت ہو گی جو دین میں تعمق کرے گی، یہاں تک کہ وہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے کہ تیر شکار سے۔

(سیرۃ ابن ہشام، الجزء الرابع، صفحہ ۱۴۴)

مذکورہ مسلمان (ذو الخویصرہ) کے معاملہ پر غور کیجئے۔ اس نے خدا کے رسولؐ کی شان میں جو گستاخی کی وہ سادہ معنوں میں صرف ایک لفظی گستاخی نہ تھی، وہ خود آپ کی حیثیتِ رسالت پر ضرب لگانے کے ہم معنی تھی۔ اس شخص نے آپ کی عدالت پر شبہ کیا تھا اور آپ کو اپنے خیال کے مطابق غیر عادل بتایا تھا۔ یہ بات انتہائی حد تک سنگین ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت قرآن کے راوی کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بواسطہ جبریلؑ خدا کا کلام پایا ہے۔ اور اس کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ آپ کی اسی روایت پر یقین کر کے ہم قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں۔

یہ معلوم ہے کہ کسی روایت کو قبول کرنے کے لیے راوی کا عادل ہونا شرط لازم ہے۔ جس راوی کی عدالت مشتبہ ہو، اس کی روایت کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ ایسی حالت میں مذکورہ تمیمی مسلمان کا آپ کو غیر عادل بتانا گویا آپ کے راوئ قرآن ہونے کی حیثیت کو مشتبہ قرار دینا ہے۔ یہ بلاشبہہ سب سے زیادہ سخت بات ہے جو آپ کے خلاف کہی جا سکتی ہے۔ مذکورہ شخص نے اتنی سنگین بات کہی، اس کے باوجود اس کو نہ کوئی سزا دی گئی اور نہ اس کو قتل کیا گیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ رسول اللہؐ کی شان

میں گستاخی بجائے خود کوئی واجب القتل جرم نہیں ہے۔ کسی کے واجب القتل ہونے کے لیے اسی کے ساتھ کچھ مزید اسباب درکار ہیں۔ مثلاً ریاست اسلامی سے بغاوت۔ چند افراد جو دورِ اوّل میں قتل کیے گئے ہیں، ان کا معاملہ اسی دوسرے حکم کے تحت آتا ہے۔ انہیں ریاست سے بغاوت کے جرم میں قتل کیا گیا نہ کہ مجرد گستاخیٔ رسول کے جرم میں۔

۲ شعبان ۶ھ میں وہ غزوہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ بنی المصطلق کہا جاتا ہے۔ اس غزوہ کے لیے جو لشکر روانہ ہوا، اس میں عبداللہ بن ابی اور دوسرے بہت سے منافق قسم کے مسلمان بھی شریک تھے۔ یہ لوگ اپنی بے حسی اور بے خوفی کی بنا پر معمولی باتوں کو شوشہ بنا لیتے اور رسول اللہؐ اور مخلص مسلمانوں کے خلاف فتنے برپا کرتے رہتے۔

اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ عائشہ بنت ابی بکر بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ واپسی میں فوج نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہؓ حسبِ معمول رات کے آخری حصہ میں رفع حاجت کے لیے دور چلی گئیں۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک معمولی قسم کا ہار تھا، وہ اتفاق سے ٹوٹ کر گر پڑا۔ حضرت عائشہ اس کو تلاش کرنے لگیں۔ اندھیرے کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ دیر لگ گئی۔

حضرت عائشہؓ ابھی لوٹی نہیں تھیں کہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ کوچ کے وقت حضرت عائشہ اپنے ہودج میں بیٹھ جاتی تھیں جو چاروں طرف کپڑے سے ڈھکا ہوتا تھا، اور چار آدمی اس کو اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک چھوٹی اور دُبلی خاتون تھیں۔ چنانچہ ہودج اٹھانے والوں کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ اس میں کوئی سواری نہیں ہے۔ انھوں نے خالی ہودج کو اونٹ پر رکھ دیا اور اس کو لے کر روانہ ہو گئے۔

حضرت عائشہ واپس آئیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ بظاہر کوئی صورت نہ پا کر وہ وہیں چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔ صبح کے وقت صفوان بن معطّل سُلمی وہاں آئے جو قافلہ کے پیچھے چلنے پر مامور تھے۔ میدان میں ایک خاتون کو دیکھ کر وہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ (عائشہ) ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس کے سوا انھوں نے کوئی اور کلام نہ کیا۔ صرف اپنا اونٹ لاکر حضرت عائشہ کے پاس

بٹھادیا۔ حضرت عائشہ اشارہ کو سمجھ کر اونٹ پر سوار ہوگئیں ۔ اس کے بعد وہ اونٹ کی نکیل پکڑ کر تیزی سے آگے کی طرف روانہ ہو گئے ۔

دوپہر کے قریب یہ اونٹ مسلمانوں کے قافلہ سے جا ملا جبکہ وہ اگلے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ابن ابی مُلیکہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ جب اس طرح قافلہ میں پہنچیں تو منافقین کے ایک گروہ نے ان کو دیکھ لیا جو عبد اللہ بن ابی کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے سردار عبد اللہ بن ابی نے پوچھا کہ یہ کون ہے ۔ لوگوں نے بتایا کہ عائشہ ہیں۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم، نہ یہ اس سے بچی ہیں اور نہ وہ ان سے بچا ہے ۔ اس نے مزید کہا کہ تمہارے پیغمبر کی بیوی نے ایک غیر شخص کے ساتھ رات گزاری، یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اب وہ ان کو لے کر آرہا ہے۔ (قال عبد اللہ بن ابیّ رئیسہم من ھٰذہ ۔ قالوا عائشۃ ۔ قال : واللہ ما نجت منہ وما نجا منہا۔ وقال : امرأۃ نبیکم باتت مع رجل حتیٰ اصبحت ثم جاء یقود بہا، (التفسیر المظہری، المجلد السادس، صفحہ ۴۷۴)

اس کے بعد جب یہ قافلہ مدینہ پہنچا تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی سرگرم ہو گئے ۔ انھوں نے اس معاملہ کو پروپیگنڈہ کا اشو بنایا اور اس کو بھرپور طور پر آپ کے خلاف استعمال کیا۔ یہاں تک کہ سارے شہر میں ہنگامی حالت پیدا ہوگئی ۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا، ہر زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھے ۔ حضرت عائشہ کا یہ حال تھا کہ وہ رات دن روتی رہتی تھیں ۔ اس قصہ کی تفصیلات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

یہ ہنگامی صورتِ حال ایک مہینہ تک جاری رہی ۔ یہاں تک کہ سورہ النور کی آیتیں ۱۱۔۲۱ اُتریں ۔ ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ عائشہ مکمل طور پر معصوم اور بے قصور ہیں ۔ اس معاملہ میں سارا جرم یک طرفہ طور پر عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا ہے ۔ اس طرح یہ سنگین معاملہ براہِ راست خدائی مداخلت کے ذریعہ ختم ہوا۔

عبد اللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ

مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت کے ساتھ اتنا بڑا بہتان تراشا۔ خود قرآن کی گواہی (النور، ۱۱) کے مطابق، اس معاملہ میں عبداللہ بن ابی سب سے بڑا مجرم تھا۔ قرآن میں اس کے ابلیسی جرم کا اعلان کیا گیا، مگر اس کے لیے کوئی قانونی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ اس کی سزا کے معاملہ کو تمام تر آخرت پر چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ وہ اس واقعہ کے بعد زندہ رہا، یہاں تک کہ مدینہ میں اپنی طبعی موت سے مر کر وہ اپنا حساب دینے کے لیے خدا کے یہاں چلا گیا۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے عبداللہ بن ابی کی بابت کہا کہ اے خدا کے رسولؐ، مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو، لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں (صفحہ ۷۰) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے مزید یہ فرمایا کہ ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور بہتر سلوک کریں گے، جب تک وہ ہمارے درمیان رہے (بل نترفق بہ ونحسن صحبتہ ما بقی معنا، تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع صفحہ ۷۲)

عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو کچھ کیا، وہ آپ کی اور آپ کے اہلِ بیت کی کردار کشی کی بدترین صورت تھی۔ یہ پیغمبر کے خلاف اتنی بڑی مجرمانہ حرکت تھی کہ اس سے بڑی کسی مجرمانہ حرکت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مدینہ کے حاکم تھے۔ اس اعتبار سے آپ کو عبداللہ بن ابی کے اوپر کامل قانونی اختیار حاصل تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس کو قتل نہیں کرایا۔ صرف اس کے جرم کا اعلان کر کے اس کو آزاد چھوڑ دیا۔

ایسی حالت میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھ گستاخی علی الاطلاق طور پر مستوجب قتل جرم ہے، وہ ایک ایسی بات کہتے ہیں جس کے لیے ان کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

خدائی ضمانت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بگاڑنے اور آپ کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش آپ کے ہم عصر یہودیوں نے شروع کی جو اس وقت عرب میں آباد تھے۔ پھر صلیبی جنگوں کے بعد یورپ کے مسیحی علماء اور مستشرقین نے صدیوں تک اسے پوری قوت کے ساتھ جاری رکھا۔ موجودہ زمانہ میں ہندستان کے سلمان رشدی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ یہی نازیبا کام جدید ترین ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے انجام دے رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لیے کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ غصہ اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کریں۔ وہ ایسی کتابوں کے خلاف ایجی ٹیشن اور ہنگامہ شروع کردیں۔ اب تک مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے عملاً بس اسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور بدقسمتی سے مسلمان اپنے منفی جوش کی وجہ سے اب تک اس دوسرے پہلو سے آگاہ نہ ہو سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے کعب بن اشرف سے لے کر بیسویں صدی کے سلمان رشدی تک بے شمار لوگ مسلسل اس معاندانہ کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ وہ آپ کی تصویر کو داغدار کریں۔ اس مخالفانہ عمل پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہو جائیں گے۔ مگر ان دشمنانِ رسولؐ کو اپنے مقصد میں ایک فی صد کامیابی بھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کی ساری کوششیں عملاً کامل طور پر بے نتیجہ رہیں۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی قسم کی نازیبا کوششیں پچھلے پیغمبروں کے خلاف بھی کی گئیں مگر یہاں نتیجہ بالکل مختلف رہا۔ یہاں ان کے دشمنوں کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ سابق پیغمبروں کے دشمنوں نے ان کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو بگاڑنا یا معدوم کردینا چاہا۔ اور عملاً بگاڑ دیا یا معدوم کر ڈالا۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک ہر پیغمبر کے خلاف انھوں نے اپنی تحریفی کوشش کی اور ہر بار وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے۔

انسانی تاریخ کا جو مدوّن ریکارڈ ہے، اس میں پچھلے تمام پیغمبروں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مصر کی قدیم تاریخ میں فرعون کا ذکر ہے مگر موسیٰؑ کا اس میں کوئی ذکر نہیں۔ فلسطین کی تاریخ سے مسیحؑ کا ذکر حذف ہے، جب کہ آپ کے ہم عصر رومی حکمرانوں کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن کے علاوہ، پچھلے پیغمبروں کی بابت جاننے کا واحد ذریعہ بائبل ہے اور بائبل کا یہ حال ہے کہ اس میں تمام پیغمبروں کو مسخ شدہ حالت میں پیش کیا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بارہ میں بائبل کا بیان ہے کہ نوح کاشتکاری کرنے لگا۔ اس نے ایک انگور کا باغ لگایا، اور اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ میں برہنہ ہوگیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا۔ (پیدائش، باب ۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ بائبل میں ملتا ہے۔ مگر اس میں آپ کی غیر متعلق خاندانی باتوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، مگر آپ کی دعوتِ توحید کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہیں۔ (پیدائش، باب ۱۵)

حضرت لوط علیہ السلام ایک سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل میں ان کی تصویر یہ دی گئی ہے کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو مے پلایا اور رات کے وقت ان کے ساتھ ہم آغوش ہوئیں۔ اور پھر لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ (پیدائش، باب ۱۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی چمک قرآن کے مطابق ایک خدائی نشانی تھی۔ مگر بائبل کا بیان ہے کہ موسیٰ نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔ (خروج، باب ۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام خدا کے سچے پیغمبر تھے۔ مگر بائبل ان کی بابت کہتی ہے کہ سلیمان بہت سی اجنبی عورتوں سے محبت کرنے لگا۔ یہ ان قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے کہا تھا کہ ان کے بیچ نہ جانا، کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کی طرف مائل کرلیں گی۔ سلیمان ان ہی کے عشق کا دم بھرنے لگا۔ اس کی بیویوں نے اس کے دل کو پھیر دیا۔ کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہوگیا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کرلیا اور اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا۔ اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی۔ (۱۔ سلاطین، باب ۱۱)

یہ صرف چند حوالے ہیں جو بطور مثال یہاں درج کیے گئے ہیں نہ کہ بطور احاطہ۔ تفصیل کے طالب

بائبل کا مطالعہ کر کے اسے جان سکتے ہیں۔

پیغمبروں کی طویل فہرست میں اس اعتبار سے صرف ایک استثنار ہے، اور وہ پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ تمام معلوم پیغمبروں میں آپ اکیلے پیغمبر ہیں جن کی تصویر بگاڑنے کی ہر کوشش مسلسل ناکام ہوتی چلی جارہی ہے۔ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات کا ریکارڈ اپنی کامل ترین ابتدائی شکل میں آج بھی پوری طرح محفوظ ہے اور کسی بھی شخص کے لیے ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کر کے اس کو بخوبی طور پر جان سکے۔

یہ محض ایک اتفاق کی بات نہیں اور نہ یہ مسلمانوں کی کوششوں کی بنا پر ہے۔ یہ براہ راست خدا کی مداخلت کے تحت ہے۔ یہ خود خدا ہے جس نے آپ کے معاندین کی معاندانہ کوششوں کو مکمل طور پر ناکام بنا رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جن شیطانی کتابوں (Satanic books) پر انسانی حکومتوں سے پابندی لگانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ پابندی پیغمبر اسلام کے معاملہ میں، خود مالک کائنات کی طرف سے زیادہ بڑے پیمانے پر پہلے ہی سے لگی ہوئی ہے۔ امتحانی آزادی کی بنا پر خدا نے کسی دشمن حق کے زبان وقلم کو تو نہیں پکڑا۔ مگر اس کی زبان وقلم کی کاوشوں کے نتیجہ کو یقیناً پکڑ رکھا ہے۔ اس نے انہیں عملی طور پر موثر بننے سے روک دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاندین اپنی ساری کوششوں کے باوجود، باعتبار نتیجہ، پیغمبر آخر الزماں کی تصویر کو بگاڑنے کے معاملہ میں وہ کامیابی حاصل نہ کر سکے جو پچھلے پیغمبروں کے معاملہ میں بلا استثنار انھوں نے حاصل کر لی۔

خدائی ضمانت

قرآن میں بار بار مخالفوں کے تمسخر اور استہزار کا ذکر ہے۔ مگر کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جب بھی کسی کو استہزار کرتے ہوئے پاؤ تو فوراً اس کو پکڑ کر قتل کر ڈالو۔ اس کے برعکس قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ تم اپنی ساری توجہ دعوت وتبلیغ کے کام پر مرتکز رکھو، اور استہزار کرنے والوں کو سزا دینے کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دو:

فاصدع بما تومر واعرض عن المشرکین	پس جس چیز کا تم کو حکم ملا ہے اس کو کھول کر سنا دو۔
انا کفینا ک المستھزئین ۵ الذین	اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم تمہاری طرف سے
یجعلون مع اللہ الٰھاً آخر فسوف	ان مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں۔ جو

يعلمون ٥ ولقد نعلم انك يضيق صدرك بما يقولون ٥ فسبح بحمد ربك وكن من الساجدين ٥ واعبد ربك حتىٰ يأتيك اليقين ٥

(الحجر ۹۴—۹۹)

اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرتے ہیں۔ پس عنقریب وہ جان لیں گے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ پس تم اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے بنو۔ اور اپنے رب کی عبادت کرو۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس یقینی بات آجائے۔

ان آیات کے تحت مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ، ابن کثیر کے الفاظ میں، یہ ہے کہ تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تمہارے اوپر اتارا گیا ہے، اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اور مشرکین کی طرف متوجہ نہ ہو جو تم کو آیاتِ الٰہی کی تبلیغ سے روک دینا چاہتے ہیں۔ تم ان سے نہ ڈرو۔ کیونکہ اللہ ان کی طرف سے تمہارے لیے کافی ہے۔ اور تم کو ان سے محفوظ رکھنے والا ہے (بلغ ما انزل اليك من ربك ولا تلتفت الى المشركين الذين يريدون ان يصدوك عن آيات الله وكلا تخفهم فان الله كافيك اياهم وحافظك منهم، الجزء الثانی، صفحہ ۵۵۹)

قرآن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں داعی کا طریقہ اعراض ہے نہ کہ جواب اور مقابلہ۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنی ساری توجہ صرف پیغام رسانی کے کام پر لگائے رہے۔ مدعو کی طرف سے استہزار اور ایذا رسانی کا ردعمل سامنے آئے تو ہرگز وہ اس سے براہ راست نہ الجھے۔ وہ ایسے لوگوں کے معاملہ کو تمام تر اللہ کے اوپر چھوڑ دے۔ قرآن کے مطابق، دعوت دینا داعی کا کام ہے اور مستہزئین سے نمٹنا اللہ کا کام۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا ہے کہ مستہزئین کے مقابلہ میں ہم تمہاری طرف سے کافی ہیں، (انا كفيناك المستهزئين) اس خدائی ضمانت کا کوئی وقتی یا محدود مطلب نہیں لیا جاسکتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایک ابدی پیغمبر تھے، اس لیے ضمانت کا یہ وعدہ بھی ابدی وعدہ ہے۔ یعنی اس کا تعلق اسلام کے زمانۂ اول سے بھی ہے جب کہ آپ اپنے وجود مقدس کے ساتھ دنیا میں موجود تھے۔ اور بعد کے زمانہ سے بھی جب کہ آپ اپنے پیغام حق کے ساتھ دنیا

میں موجود ہیں۔ اور اہل عالم کو مسلسل اپنی دعوت پہنچا رہے ہیں۔

استہزار کرنے والا کسی کا استہزار کیوں کرتا ہے۔ وہ اس لیے ایسا کرتا ہے کہ زیر استہزار شخصیت لوگوں کی نظر میں حقیر ہو کر رہ جائے۔ وہ لوگوں کو اس قابل نظر نہ آئے وہ اس کو اہمیت دیں اور اس کے پیغام پر غور کریں۔ یہی مقصد قدیم زمانہ میں پیغمبر کے مستہزئین کا تھا۔ اور یہی بعد کے زمانہ کے مستہزئین کا ہے۔

اس اعتبار سے استہزار کا جواب یہ نہیں ہے کہ مستہزی شخص کو قتل کر دیا جائے۔ اس کا زیادہ حقیقی اور زیادہ کارگر جواب یہ ہے کہ جس شخصیت کا استہزار کیا جا رہا ہے، اس کو اتنا بلند اور اتنا مسلّم الثبوت بنا دیا جائے کہ استہزار کرنے والوں کا استہزار اس پر اثر انداز ہی نہ ہو۔

اگر کوئی شخص ہمالیہ پہاڑ کو ایک چھوٹا ٹیلہ کہہ کر اس کا مذاق اڑائے تو یہ مذاق اس کے اوپر چسپاں نہ ہوگا۔ کیونکہ ہمالیہ کی غیر معمولی عظمت خود ہی اس مذاق کی تردید ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہاتھی کو چیونٹی کہہ کر اس کی ہنسی اڑائے تو یہ ہنسی بھی ہاتھی کے اوپر چسپاں نہ ہوگی۔ کیونکہ ہاتھی کا غیر معمولی ڈیل ڈول اپنے آپ اس ہنسی کو بے معنی ثابت کر رہا ہے، اس قسم کا تمسخر اتنا بے معنی ہے کہ اس کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی تردید آپ ہے۔

پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ آپ کے ساتھ ایسے غیر معمولی نوعیت کے تاریخی حالات جمع کیے گئے ہیں کہ آپ کی شخصی عظمت عالمی سطح پر ایک مسلّمہ واقعہ بن چکی ہے۔ آپ اب کوئی متنازعہ شخصیت نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایسی شخصیت ہیں جس کی بڑائی کا اعتراف کرنے پر ہر آدمی مجبور ہو، خواہ وہ آپ پر عقیدہ رکھتا ہو یا عقیدہ نہ رکھتا ہو۔

چنانچہ موجودہ زمانہ میں غیر مسلم مصنفین نے کثرت سے ایسی کتابیں لکھی ہیں جن میں آپ کی غیر معمولی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ٹامس کارلائل نے آپ کو تمام پیغمبروں کا ہیرو قرار دیا ہے۔ مائیکل ہارٹ نے دنیا کے سو بڑے انسانوں کی فہرست بنائی تو اس میں آپ کو نمبر ایک پر رکھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے مقام عظمت پر فائز کر دیا ہے کہ اب کسی مستہزی کا استہزار خود مستہزی کو لوگوں کی نظر میں حقیر بنا دے، اس کا استہزار کسی بھی درجہ میں آپ کے اوپر چسپاں نہ ہو۔ اس فیصلہ الٰہی کی پیشگی خبر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو دیدی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ مکہ کے قریش آپ کو مذمّم (مذمّت کیا ہوا، ملامت زدہ) کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خلاف کوئی براہِ راست کارروائی نہیں کی۔ اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ قریش کی اس ایذا رسانی پر مجھے تعجب ہے۔ وہ مجھے گالی دیتے ہیں اور مجھ کو مذمّم کہتے ہیں۔ حالانکہ میں محمّد ہوں، (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاوّل، صفحہ ۳۷۹)

یعنی کائنات ارض وسماء کے مالک نے میرے لیے مقدر کر دیا ہے کہ عالمی تاریخ میں مجھ کو محمّد (تعریف کیا ہوا) کی حیثیت سے جگہ ملے۔ ایسی حالت میں ان کے جھوٹے سب وشتم کی کیا حقیقت۔

اسی خدائی ضمانت کا یہ کرشمہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب کی اعلیٰ طباعت اور اس کی زبردست پبلسٹی کے باوجود ساری دنیا میں کوئی ایک شخص نہیں جو اس بے ہودہ کتاب کو پڑھ کر اس سے متاثر ہوا ہو یا اس کی رائے پیغمبر اسلام کے بارہ میں خراب ہو جائے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد عالمی اخبارات میں قارئین کے بے شمار خطوط چھپے ہیں۔ مگر کسی ایک شخص نے یہ بات نہیں لکھی کہ اس کتاب نے میری نظر میں پیغمبر اسلام کی تصویر بگاڑ دی۔ میری نگاہ میں ان کا جو تقدس پہلے تھا، وہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد باقی نہ رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے خود مصنف کی تصویر کو بگاڑا ہے نہ کہ پیغمبر اسلام کی تصویر کو۔

اصل ذمہ داری سے غفلت

مذکورہ آیت (الحجر ۹۴) اور اس طرح کی دوسری قرآنی آیتوں سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پیغمبر کی لائی ہوئی تعلیمات کو لوگوں کے سامنے پیش کریں نہ یہ کہ پیغمبر کے خلاف گستاخی کرنے والوں سے لڑائی لڑتے رہیں۔ پہلا کام اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ذمہ کیا ہے، اور دوسرا کام اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جس کام کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ موثر طور پر خود اپنے ذمہ لے رکھا ہے، اس کے لیے وہ بے فائدہ طور پر شور وغل کرتے ہیں۔ اور جس کام کو اللہ نے خود اُن کے ذمہ کیا ہے، اس کے لیے وہ متحرک نہیں ہوتے۔ اس نوعیت کی سرگرمی خدا کے مقابلہ میں سرکشی ہے نہ کہ خدا کے حکم کی تعمیل۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان پیغمبر اسلام کے دین کی اشاعت کے لیے تو کچھ نہیں کرتے، البتہ اگر کوئی معاند ایک لغو بیان دے یا ایک مخالفانہ تحریر چھاپے تو اس کے خلاف شور وغل کرنے میں

وہ نہایت تیزی دکھاتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کوتاہی کو بتا رہا ہے۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ مسلمان وہ کام کرنے کے لیے تو بہت بے قرار ہیں جس کا اہتمام خدا نے خود اپنی طرف سے کر رکھا ہے۔ مگر اس کام کو کرنے کے لیے ان کے اندر کوئی تڑپ موجود نہیں جو شریعت کے مطابق انہیں خود اپنی کوششوں کے ذریعہ انجام دینا ہے۔

قرآن کے مطابق مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی نصرت کریں۔ مگر نصرت سے مراد دعوت ہے نہ کہ دوسروں کے خلاف شور وغل۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ پیغمبر آخر الزماں پر طعن کرنے والوں کے خلاف شور وغل کر کے انھیں پیغمبر آخر الزماں کی نصرت کا کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ یہ کریڈٹ انھیں صرف اس وقت ملے گا جب کہ وہ پیغمبر آخر الزماں کے پیغام کی اشاعت کے لیے اٹھیں اور اس کو اس کے تمام ضروری آداب وشرائط کے ساتھ ساری قوموں کے سامنے انجام دیں۔

مسلمانوں کی موجودہ روش کیوں ہے، اس کا نہایت گہرا نفسیاتی سبب ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان، مختلف اسباب سے، دوسری قوموں کے بارہ میں نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ ان کے بارہ میں وہ محبت اور خیر خواہی کا جذبہ نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کے خلاف بھڑکنے کا موقع ہو تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسری قوموں کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کی بات ہو تو اس کے لیے وہ متحرک نہیں ہوتے۔

"رسولؐ کی شان میں گستاخی" کے مسئلہ پر اٹھنے کے لیے صرف نفرت کا جذبہ کافی ہے، جو مسلمانوں کے اندر کافی مقدار میں موجود ہے۔ اس کے برعکس "رسولؐ کے پیغام کی اشاعت" کے لیے محبت کا جذبہ درکار ہے جو آج کے مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے سوال پر تیزی سے حرکت میں آجاتے ہیں اور دوسرے سوال پر وہ حرکت میں نہیں آتے، خواہ اس کے لیے انھیں کتنا ہی زیادہ پکارا جائے۔ یہ صورت حال حد درجہ تشویشناک ہے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اس روش پر نظر ثانی کریں، یہ روش یقینی طور پر خدا کے نقشہ کے مطابق نہیں۔

پہلا کام اتمام حجت

مسلمانوں کا پہلا کام دوسروں کو سزا دینا نہیں ہے، ان کا پہلا کام دعوت دینا ہے اور اس کو

اس کے تمام آداب وشرائط کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے اتمام حجت تک پہنچانا ہے۔ اور شرائطِ دعوت میں سب سے اہم شرط یہ ہے کہ مدعو کی ہر زیادتی اور گستاخی کو اس وقت تک یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے جب تک اس کی ہدایت کے بارہ میں آخری مایوسی کا مرحلہ نہ آجائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض افراد کو سزائیں بھی دی ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں جن واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے، ان تمام واقعات میں سببِ قتل یا تو نقض عہد تھا یا انکارِ رسالت بعد از اتمام حجت۔ سادہ طور پر محض شتم کی بنا پر کسی ایک شخص کو بھی رسول یا اصحاب رسول نے کبھی قتل نہیں کیا۔

پانچواں باب

سوچنے کی بات

قرآن خدا کی کتاب ہے جو کائناتی حقیقتوں کو بیان کرتی ہے۔ قرآن میں جن حقیقتوں کا اعلان کیا گیا ہے، ان میں سے ایک عالمگیر حقیقت وہ ہے جو ان لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے۔ فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا (پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کیساتھ آسانی ہے)

موجودہ دنیا میں جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح یہاں دشواری کے ساتھ آسانی کا پہلو بھی ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ کبھی خوش گوار امکانات کو ختم نہ کر سکے۔ ہر ناپسندیدہ صورت حال میں دوبارہ ایک پسندیدہ موقع آدمی کے لیے باقی رہے۔ امکانات کی یہ فہرست اتنی لمبی ہے کہ اس کا سلسلہ سلمان رشدی جیسے نازیبا واقعات تک پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم مدینہ میں سلمان رشدی جیسا ایک بُرا کردار موجود تھا۔ یہ عبداللہ بن ابی بن سلول ہے۔ اس ظالم نے ایک بار ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر نعوذ باللہ بدکاری کا الزام لگایا۔ یہ جھوٹی کہانی اس طرح پھیلی کہ پورے مدینہ میں ایک مہینہ تک ہنگامی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد قرآن میں اس کی تردید اتاری گئی جو سورۃ النور (رکوع ۲) میں موجود ہے۔

ان تردیدی آیات میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ: لا تحسبوہ شرا لکم بل ھو خیر لکم (النور ۱۱) یعنی اے مسلمانو، یہ طوفان جو تمہارے خلاف برپا کیا گیا ہے، اس کو تم اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے حق میں اچھا ہے۔ بہتان تراشی کا واقعہ بظاہر "عسر" کا ایک واقعہ تھا۔ مگر قرآن نے بتایا کہ اس میں بھی تمہارے لیے "یسر" کا یقینی پہلو چھپا ہوا ہے۔

اس یُسر (موافق پہلو) کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ جب داعی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے تو اس کی ذات اور اس کی دعوت لوگوں کے درمیان گفتگو کا موضوع بن جاتی ہے۔ وہ لوگوں کے لیے ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس

طرح داعی کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان جھوٹے پروپیگنڈوں کی تردید کرکے اصل حقیقت کو واضح کرے۔ وہ اپنی بات کو ازسرِنو مزید وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔

اس طرح ایک طرف مخالفین کا برسرِ باطل ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری طرف داعی کا برسرِ حق ہونا اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ وہ اور زیادہ ثابت شدہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ دعوتِ حق سے متعارف ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ ابھی تک شبہات کا شکار تھے، وہ اس کے بعد یقین کے درجہ تک پہنچ کر داعی کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لوگ اپنی آنکھوں سے عیاناً دیکھ لیتے ہیں کہ حق کا داعی ٹھوس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مخالفین کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس جھوٹے الزام اور بے بنیاد اتہام کے سوا اور کچھ نہیں۔

اصل مسئلہ

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس معاملہ میں قابلِ غور مسئلہ یہ نہیں ہے کہ یہاں رشدی جیسے لوگ ہیں جو اسلام کے خلاف لکھتے اور بولتے ہیں۔ بلکہ اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ وہ کون سے حالات ہیں جس نے انہیں یہ موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف لکھیں اور بولیں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ برطانیہ میں ۱۷ویں صدی سے ایک قانون موجود ہے جو مسیحیت (اینگلیکن چرچ) کے خلاف کفریہ کلمات (Blasphemy) کو قابلِ سزا جرم قرار دیتا ہے۔ مگر اس تعزیری قانون کے ہوتے ہوئے برطانیہ میں ایک فلم بنائی گئی ہے جو سراسر اس کی منشا کے خلاف ہے۔ اس فلم کا نام ہے:

The Last Temptation of Chris.

اس فلم میں نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جنسی زندگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ ان کو اور ان کی والدۂ محترمہ (حضرت مریم) کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے ان کے تقدس پر حرف آتا ہے۔ یہ فلم برطانیہ میں کھلے طور پر دکھائی جارہی ہے مگر مذکورہ قانون کے باوجود اس فلم پر آج تک پابندی نہیں لگائی گئی اور نہ اس کے بنانے والوں کو کوئی سزا دی گئی۔

اب اسی ملک کی ایک برعکس مثال لیجئے۔ پیٹر رائٹ (Peter Wright) ایک انگریز ہے جو ریٹائر ہونے کے بعد اب آسٹریلیا میں رہتا ہے۔ وہ برطانیہ کے محکمہ انٹلجنس میں ایک اعلیٰ افسر تھا۔

ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس کا نام اسپائی کیچر (Spy Catcher) ہے۔ اس کتاب میں برطانیہ کے محکمہ جاسوسی کے بہت سے راز بتائے گئے ہیں۔

پیٹر رائٹ نے اپنی یہ کتاب لندن کے ایک پبلشر کے ہاتھ فروخت کی مگر اس کی اشاعت سے پہلے حکومتِ برطانیہ کو اس کا علم ہوگیا۔ اس نے فوراً یہ کہہ کر اس پر پابندی لگادی کہ یہ کتاب سرکاری رازوں کی پردہ داری کے خلاف ہے۔ مصنف اور پبلشر کی تمام کوششوں کے باوجود یہ کتاب لندن سے چھپ نہ سکی۔ ۱۹۸۸ میں وہ ایک بیرونی ملک میں چھاپی گئی ہے۔ تاہم برطانی حدود میں اس کا داخلہ مکمل طور پر ممنوع ہے۔

اس تقابلی مثال پر غور کیجئے۔ ایک ہی ملک ہے۔ وہاں "توہین پیغمبر" کا واقعہ ہوتا ہے مگر باقاعدہ قانون کے ہوتے ہوئے بھی اس پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ دوسری طرف اسی ملک میں "توہین ریاست" کا واقعہ ہوتا ہے تو حکومت اس کے خلاف فوراً سرگرم ہوجاتی ہے اور پورا ملک اس کو اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کردیتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ برطانیہ توہین ریاست کی اہمیت سے واقف ہے، مگر توہین نبوت کی اہمیت کا اسے احساس نہیں۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ان کے یہاں دونوں مثالوں میں وہ فرق پیدا کردیا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ آج اسلام کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کی عظمت و اہمیت جدید لوگوں کے ذہن سے نکل گئی ہے۔ وہ اسلام کو ایک بے قیمت اور آج کے لحاظ سے بے ضرورت چیز سمجھنے لگے ہیں۔ یہی وہ حالات ہیں جس نے لوگوں کو اسلام کے خلاف بولنے کے لیے جری کردیا ہے۔ نہ صرف غیر مسلموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو مذکورہ قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں، چنانچہ وہ اسلام کے خلاف نہایت سطحی انداز میں لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔

اس وقت جڑ کا کام یہ ہے کہ اسلام کے بارہ میں جدید انسان کی غلط فہمی کو دور کیا جائے۔ اسلام کی اہمیت کو آج کے انسان کے لیے دوبارہ ایک ثابت شدہ حقیقت بنایا جائے۔ اسلام کی تصویر کو لوگوں کی نظر میں اتنا باعظمت بنادیا جائے کہ کوئی آدمی اس کے خلاف بولنے کی جرأت نہ

کر سکے۔ اور اگر بالفرض کوئی شخص اس قسم کی نازیبا حرکت کرے تو اس کی بات ماحول کے اندر اپنے آپ بے وزن ہو کر رہ جائے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آج کوئی شخص جمہوریت (ڈیموکریسی) کے خلاف بولے تو اس کی بات موجودہ ماحول میں اپنے آپ بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

جدید اسلامی لٹریچر

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سلمان رشدی جیسے لوگ جب کوئی شر پھیلاتے ہیں تو وہ ہمارے لیے صرف شر بن کر رہ جاتا ہے، وہ ہمارے لیے خیر کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے امام اور مفکر ایسے لوگوں کے سامنے اسلام کا جو تعارف پیش کر رہے ہیں، وہ صرف شور وغل ہے، اور شور وغل آج کے انسان کو صرف متنفر کر سکتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں اس کو متاثر کرنے والا نہیں۔

ایسے مواقع پر فطری طور پر اسلام کے مطالعہ کی فضا بنتی ہے۔ لوگوں کے اندر اسلام کے بارہ میں تجسس پیدا ہوتا ہے، وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ اسلام کو جاننے کے خواہش مند ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ پاتے ہیں کہ موجودہ کتب خانوں میں ایسا لٹریچر موجود نہیں جو ان کی قابلِ فہم زبان میں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو پیش کر رہا ہو۔ جس کے اندر اتنی جاذبیت ہو کہ وہ اس کو دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھ سکیں۔ آج کے انسان کے اردگرد مخالف اسلام لٹریچر کا انبار موجود ہے، مگر موثر اسلوب میں تیار کیا ہوا موافق اسلام لٹریچر کا کہیں وجود نہیں۔

راقم الحروف نے چالیس سال پہلے عصر حاضر کی اس ضرورت کا احساس کیا تھا۔ اس کے مطابق میں نے اسلام کا تفصیلی مطالعہ کیا، اور اسی کے ساتھ جدید علوم کو اس کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد میں نے عصری تقاضوں کے تحت ایسا اسلامی لٹریچر تیار کرنا شروع کیا جو آج کے انسان کے ذہن پر اسلام کی عظمت قائم کر سکے۔ میری تمام کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے اسی خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کام میں اگرچہ مجھے ملّت کا مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اپنی حد تک میں نے اپنی پوری طاقت اسی ایک کام میں لگا رکھی ہے۔

اسی خاص ضرورت کے تحت حال میں، میں نے ایک نئی کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے۔ "اسلام دورِ جدید کا خالق" یہ کتاب ایک سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اور وہ الحمد للہ

اسلامی مرکز کے تحت چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

اس تازہ کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ جدید سائنس اور موجودہ ترقی یافتہ دور جس پر آج کا انسان فخر کرتا ہے، وہ تمام تر اسلام کا عطیہ ہے یہ رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کے ذریعہ لایا جانے والا اسلامی انقلاب ہے جس نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار وہ عمل جاری کیا جس کے نتیجہ میں بالآخر دورِ جدید کی تمام ترقیاں ظہور میں آئیں۔ یہ کتاب اوّلاً انشاء اللہ اُردو زبان میں شائع کی جائے گی، اور اس کے بعد انگریزی اور دوسری زبانوں میں۔ وبیداللہ التوفیق۔

خاموشی کی طاقت

حضرت عمر فاروق رضؓ کا ایک بہت بامعنی قول ہے۔ آپ نے فرمایا کہ باطل کو مارو اس کی طرف سے چپ رہ کر (امیتوا الباطل بالصمت عنہ)

الوعی الاسلامی، کویت، جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ، جنوری ۱۹۸۷ء

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات شر اور باطل کے بارہ میں خاموش رہ جانا اور اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرنا ہی اس کو ختم کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس صمت عن الباطل کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ محض ذاتی بغض کی بنا پر آپ کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلاتے ہیں اور بیہودہ مضامین شائع کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر آپ ان کا جواب دیں تو آپ صرف اپنا وقت ضائع کریں گے۔ ایسی باتوں کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا جواب نہ دیا جائے۔ قدیم مثل ہے کہ "کتے بھونکتے رہتے ہیں، ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔ آپ "ہاتھی" والا کردار ادا کیجئے، نشر پسندوں کے چھیڑے ہوئے فتنے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

ایک شخص آپ کے اوپر کیچڑ پھینکتا ہے۔ آپ کے گھر میں گندگی ڈال دیتا ہے۔ اب اگر آپ مشتعل ہو کر اس سے لڑنے لگیں تو آپ نے اس کے مقصد کو پورا کیا۔ آپ کی اشتعال انگیز کارروائی اس کو مزید موقع دے گی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے آپ کے خلاف مکمل فساد برپا کر دے گا۔ لیکن اگر آپ اس کی اشتعال انگیزی پر مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس کے بم کو ناکارہ کر دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہی بات ایک اور انداز سے فرمائی ہے جس کو قرآن میں اعراض کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اعراض کا مطلب ہے اوائڈ کرنا، نظر انداز کرنا۔ اعراض محض ایک سلبی فعل نہیں وہ ایک ایجابی کارروائی ہے۔ وہ خود ایک طاقت ور عمل ہے۔ وہ ناطق جواب کے مقابلہ میں خاموش جواب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ چپ کی طاقت بول کی طاقت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مواقع

ایسے ہیں جہاں نظر انداز کرنا کسی شر کو دفع کرنے کی سب سے زیادہ موثر تدبیر ہوتی ہے۔ جہاں سب سے بڑی کارروائی یہ ہوتی ہے کہ سرے سے کوئی کارروائی ہی نہ کی جائے۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص آپ کے خلاف ایک بے ہودہ جھوٹ گھڑتا ہے اور اس کو کتاب کی صورت میں چھاپ کر بازار میں لے آتا ہے۔ اب آپ کی کامیابی کس چیز میں ہوگی۔ آپ کی کامیابی اس میں ہوگی کہ یہ کتاب لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو کر رہ جائے۔ کوئی اس کو حاصل کر کے پڑھنے کی ضرورت نہ سمجھے۔

یہ مقصد سب سے زیادہ خاموشی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کتاب کے خلاف شور وغل کریں تو اس کا انتشار ہوگا۔ لوگ غیر ضروری طور پر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر آپ اس کی طرف سے خاموشی اختیار کر لیں تو اس کو شہرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس کی کتاب اپنے آپ مر جائے گی۔

یہ زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس کا بار بار تجربہ کیا گیا ہے اور تاریخ میں اس کو بار بار ریکارڈ کیا گیا ہے۔ مثلاً انگریزی کے ایک مصنف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا ——— افترا پردازی ہمیشہ مخالفت سے ترقی کرتی ہے :

Scandal ever improves by opposition.

کوئی شخص آپ کے خلاف جھوٹی تہمت لگائے تو اس کے بارہ میں خاموشی اختیار کر لیجئے۔ اس کے خلاف بول کر آپ اس کو پھیلائیں گے۔ اس کے بارہ میں چپ رہ کر آپ عین اسی مقام پر اس کا خاتمہ کر دیں گے جہاں وہ ابتدا ءً گھڑی گئی تھی۔

اصل کام

سلمان رشدی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ـــــــ آدھی رات کے بچے
Midnight's Children اس کتاب میں سلمان رشدی نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ میں عقیدہ اور بے عقیدگی کے درمیان جھول رہا ہوں:

I am hanging between belief and disbelief

رشدی کا یہ کہنا کہ میں مذہب کے معاملہ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان لٹکا ہوا ہوں، یہ صرف ایک شخص کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ایک پوری نسل کا معاملہ ہے۔ سلمان رشدی نے جو بات اپنے بارے میں کہی ہے یہی کروروں مسلمانوں کی بات ہے۔ مسلمانوں کی نئی نسل جس کی تعلیم جدید ماحول میں ہوئی ہے اس کا کم از کم ۵۰ فیصد حصہ اسی قسم کی بے یقینی میں مبتلا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی شخص نے رشدی والا قلمی پیشہ اختیار کیا اور وقتی فائدے کی خاطر اپنے دل کی گندگی کو کاغذ پر اُنڈیلنے لگا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ کسی اور میدان میں کھانے کمانے میں مشغول ہیں۔ چنانچہ انہیں رشدی جیسی گندی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دسمبر ۱۹۸۸ء میں جب کہ میں امریکہ میں تھا، مجھے وہاں کے ایک اسلامی مرکز میں لے جایا گیا۔ یہ مرکز جس خطہ میں واقع ہے وہاں تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ میں نے منتظمین سے پوچھا کہ اس علاقہ کے ایک لاکھ مسلمانوں میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس اسلامی مرکز سے جڑے ہوئے ہوں۔ ایک ذمہ دار نے جواب دیا کہ دس فیصد مسلمان ہیں۔ حاضرین میں سے دوسرا شخص بولا کہ آپ مبالغہ کر رہے ہیں، بمشکل ۵ فیصد تعداد ہوگی جو اس مرکز سے جڑی ہوئی ہو۔

مجھے بتایا گیا کہ جو مسلمان امریکہ میں آباد ہیں ان کی نئی نسلوں کی بیشتر تعداد اسلام سے بالکل ناواقف ہو چکی ہے۔ ان کو نماز، روزے سے کوئی مطلب نہیں، جنس اور شراب اور غذا کے معاملہ میں ان کے طریقے وہی ہیں جو دوسرے آزاد خیال امریکیوں کے ہیں۔ وہ بس برائے نام مسلمان ہیں۔

یہ کوئی انکشاف کی بات نہیں ۔ ہر وہ شخص جو مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل سے واقف ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "رشدی" ہمارے درمیان ایک نہیں، بلکہ کروروں کی تعداد میں ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی کی "رشدیت" ظاہر ہو چکی ہے اور کسی کی اب تک چھپی ہوئی ہے ۔

مسلم نسل کی یہ صورتِ حال موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کے لیے ایک زبردست چیلنج ہے ۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کی ترقی یافتہ زبانوں میں اعلیٰ معیار کا اسلامی لٹریچر تیار کر کے شائع کیا جائے تاکہ "ارتداد ذہنی" میں مبتلا ہونے والے ان بے شمار مسلمانوں کی بے یقینی کو دوبارہ یقین میں تبدیل کیا جا سکے ۔ ان کو بے عقیدگی کے دلدل سے نکال کر دوبارہ عقیدہ کی صالح زمین پر کھڑا کیا جائے ۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں جو اس کام کو موثر اسلوب اور مطلوبہ معیار پر انجام دے رہا ہو ۔ اپنے دعویٰ کے مطابق بہت سے لوگوں نے عصری کتابیں چھاپ رکھی ہیں مگر یہ نام نہاد عصری کتابیں عصری کوڑا خانہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتیں ۔

راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا "دورِ جدید کی تحریکیں" اس مضمون میں جدید لٹریچر کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہا گیا تھا کہ جدید لٹریچر دورِ جدید میں اسلام کے احیار کی ایک بنیادی ضرورت ہے ۔ مگر کتابوں کے اَن گنت انبار کے باوجود، یہ ضرورت ابھی تک غیر تکمیل شدہ حالت میں پڑی ہوئی ہے ۔ حتی کہ لوگوں کے اندر اس کا حقیقی شعور بھی موجود نہیں ۔

میں نے مزید لکھا تھا کہ میں اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں اپنے چالیس سالہ مطالعہ کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما کوئی ایک بھی ایسی قابلِ ذکر کتاب وجود میں نہ لا سکے جو جدید سائنٹفک اسلوب اور وقت کے فکری مستویٰ پر اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے والی ہو ۔ اگر بالفرض کسی صاحب کو اصرار ہو کہ ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں تو میں ان سے گزارش کروں گا کہ وہ ایسی صرف ایک کتاب راقم الحروف کے پتہ پر روانہ فرمائیں ۔

اس مضمون کی اشاعت پر اب کئی سال کی مدّت پوری ہو چکی ہے۔ مگر آج تک کسی مسلم ذمہ دار کی طرف سے ایسی کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی گئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کا اوّلین اور اہم ترین کام یہ تھا کہ وہ جدید علوم کو پڑھیں۔ وقت کی زبانوں کو سیکھیں۔ آج کے طریق استدلال اور اسلوبِ تحریر میں مہارت پیدا کریں۔ اور اس کے بعد اسلام کی ابدی تعلیمات کو موثر اور طاقتور انداز میں پیش کریں تاکہ آج کا انسان اور جدید مسلم نسل اس کو پڑھے اور اس کے ذریعہ سے اپنے کھوئے ہوئے عقیدہ کو دوبارہ حاصل کرے۔ مگر جدید اسلوب میں طاقتور لٹریچر وجود میں لانا تو درکنار، موجودہ مسلم رہنما قرآن کا ایک صحیح انگریزی ترجمہ بھی تیار کر کے شائع نہ کر سکے۔

ایسی حالت میں مسلم رہنماؤں کا سلمان رشدی کے خلاف ہنگامہ کرنا حقیقتہً خود اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کے ہم معنی ہے۔ یہ اس کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش کرنا ہے جس کو انھوں نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ بن کیے پر کریڈٹ لینا چاہیں ان کے لیے خدا کے یہاں عذاب ہے نہ کہ انعام (آل عمران ۱۸۸)

ہمارے لکھنے والوں نے موجودہ زمانہ میں جو اسلامی کتابیں تیار کی ہیں وہ غیر منحرف ذہن کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ مگر منحرف ذہن کے لئے وہ سراسر غیر مفید ہیں۔ کیوں کہ وہ منحرف ذہن کے تقاضے کو بالکل پورا نہیں کرتیں۔

ان تمام کتابوں کا یکساں طور پر یہ حال ہے جیسے کہ ان کے لکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ اعتقادی استدلال کیا ہے اور عقلی استدلال کیا۔ جو لوگ ان دونوں چیزوں کے فرق کو نہ جانیں وہ کبھی جدید نسل کے لئے اسلامی لٹریچر فراہم کرنے کا کام نہیں کر سکتے۔

یہ کتابیں تقریباً سب کی سب اعتقادی استدلال کے اصول پر لکھی گئی ہیں۔ اعتقادی استدلال صرف وہاں کارآمد ہوتا ہے جہاں زیر بحث مسئلہ میں دونوں فریق بنیادِ استدلال کے بارہ میں ایک رائے رکھتے ہوں۔ مگر جہاں اس بارہ میں دونوں فریق کی سوچ الگ الگ ہو، وہاں اعتقادی طریق استدلال بالکل بے اثر اور بے قیمت ہو جاتا ہے۔

جدید نسل جو جدید افکار سے متاثر ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی پیشگی مسلّمہ پر یقین نہیں

رکھتی۔ اس کا تصور یہ ہے کہ جو دعویٰ کیا جائے اس کو سائنس اور تاریخ کے معلوم حقائق کی بنیاد پر ثابت ہونا چاہئے۔ گویا پہلے طریق استدلال کی بنیاد اگر اعتقادی مسلّمات پر قائم ہے تو دوسرے طریق استدلال کی بنیاد عقلی مسلّمات پر۔ مگر موجودہ زمانہ میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں ہمارے لکھنے والوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اسلام کو حقیقی معنوں میں جدید انسان کے اپنے مسلمات کی بنیاد پر پیش کیا گیا ہو۔

دوسری کمزوری جو ان تمام کتابوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے وہ یہ کہ یہ کتابیں افضلیت اور برتری کی اصطلاحوں میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا مقصد براہ راست یا بالواسطہ طور پر یہ ہوتا ہے کہ اسلام یا مسلمانوں کی برتری ثابت کریں۔ اس قسم کا لٹریچر کچھ مسلمانوں کو خوش کر سکتا ہے مگر وہ جدید ذہن کے لئے ہرگز مؤثر نہیں ہو سکتا۔

جدید ذہن کو اپیل کرنے والا لٹریچر صرف وہ ہوگا جس میں یہ دکھایا گیا ہو کہ اسلام کی تعلیمات عین فطرت کے مطابق ہیں۔ اسلام اور انسانی فطرت دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ ہیں۔

تیسری کمزوری جو جدید پیدا شدہ لٹریچر میں بہت زیادہ عام ہے، وہ یہ کہ یہ کتابیں دعوت کی زبان میں نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ عداوت کی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے والے تقریباً سب کے سب اپنے سینہ میں یہ احساس لئے ہوتے ہیں کہ موجودہ دنیا اسلام کی دشمن ہو گئی ہے۔ ہر طرف اسلام کے خلاف سازشیں کی جا رہی ہیں۔ ہر قوم اسلام کو مٹانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس نفسیات کے تحت جو لٹریچر تیار کیا جائے وہ عداوتی لٹریچر ہوگا نہ کہ دعوتی لٹریچر۔

جو شخص اپنے سینہ میں مدعو کے خلاف نفرت لئے ہوئے ہو وہ پہلے مرحلہ ہی میں اس کام کے لئے اپنے کو نااہل ثابت کر رہا ہے۔ دعوتی کلام کے لئے مدعو کے حق میں محبت کی نفسیات درکار ہے نہ کہ نفرت کی نفسیات۔ اس لئے ہمارے لکھنے والے جب تک اپنے سینہ کو منفی نفسیات سے خالی نہ کریں، ان کا دعوتی لٹریچر تیار کرنا ایک جرم ہے نہ کہ کوئی واقعی اسلامی خدمت۔

سلمان رشدی جیسے واقعات کے مقابلہ میں مسلم رہنماؤں کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ اس کو مرتد قرار دے کر ان کے اوپر اسلامی سزا کے نفاذ کا اعلان کریں۔ اس کے برعکس ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ان کے کیس کو سمجھیں۔ ان کی ذہنی پیچیدگیوں کا مطالعہ کریں۔ ان کے

فکر و نظریہ سے پوری واقفیت حاصل کریں۔

اس طرح کے گہرے مطالعہ کے بعد ان کا فرض ہے کہ وہ اسلام پر ایسی کتابیں تیار کریں جو اس قسم کے لوگوں کو مطمئن کرنے والی ہوں۔ جو ان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا کر انھیں ان کے رب کے قریب کر سکیں۔

موجودہ زمانہ کے منحرف ذہنوں میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو امکانی طور پر اس کے لئے تیار ہیں کہ وہ اسلام کو اپنے دل کی آواز پا کر اسے قبول کر لیں۔ مگر یہ امکان صرف اس وقت واقعہ بن سکتا ہے جب کہ دین حق کو ان کی مانوس زبان اور ان کے قابل قبول اسلوب میں ان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

ایک پیاسا آدمی پانی کا گلاس صرف اس وقت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے جب کہ اسے یقین ہو کہ اس گلاس کے اندر جو چیز ہے وہ پانی ہے۔ اسی طرح ہر پیدا ہونے والا بلاشبہہ حق کا طالب ہے۔ مگر جو تحفہ اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کی بابت پہلے اس کو اس کی مانوس زبان میں یہ یقین دلانا ہوگا کہ یہ وہی مطلوب چیز ہے جس کو تم اپنی فطرت کے زیر اثر تلاش کر رہے تھے۔

خاتمۂ کلام

اس کتاب کے بیشتر مضامین سلمان رشدی کا مسئلہ پیش آنے کے جلد ہی بعد لکھے گئے تھے۔ اس کے کچھ حصے ماہنامہ الرسالہ میں بھی شائع ہوئے۔ یہ پورا مجموعہ ۱۹۸۹ میں کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر چھپنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ تاہم بعض وجوہ سے بروقت اس کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔ لمبی تاخیر کے بعد ۱۹۹۶ کے آخر میں اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔

اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تاخیر حکمت سے خالی نہ تھی۔ اسی تاخیر کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ "خاتمۂ کلام" کا یہ باب کتاب کے آخر میں شامل ہو سکے جو بہت بعد کو جون ۱۹۹۶ میں لکھا گیا ہے۔ اگر ۱۹۸۹ میں یہ کتاب چھپ جاتی تو وہ اس ضروری باب سے خالی ہوتی۔

ہمارا لکھنے اور بولنے والا طبقہ عام طور پر سلمان رشدی کو "اعداء اسلام" کی سازش سمجھتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ یہ اسلام کے خلاف اہل مغرب کی سازش ہے جس نے سلمان رشدی کے قصہ کی صورت اختیار کی۔ میرے نزدیک یہ محض سطحی بات ہے جو سراسر بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلمان رشدی کی کتاب مصنف کا ایک انفرادی فعل ہے نہ کہ مغربی ملکوں کا کوئی اجتماعی منصوبہ۔

موجودہ زمانہ کا نام نہاد مسلم پریس اس بات کو بہت اچھالتا رہا ہے کہ امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد امریکہ (اور اہل مغرب) نے اسلام کو اپنے دشمن کے طور پر دریافت کیا ہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹنے سے پہلے مغرب جس طرح کمیونزم کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے تھا، اسی طرح اب اس نے اسلام کو اپنے نشانہ پر رکھ لیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کو اپنے وجود کے لئے ایک عدو درکار تھا، اشتراکی عدو کے خاتمہ کے بعد اس نے اسلامی عدو کو ایجاد کر لیا ہے تاکہ عالمی سطح پر وہ اپنے بقاء کی جد وجہد جاری رکھ سکے۔ مغربی تہذیب مقابلہ کے اصول پر قائم ہے، اور مقابلہ آرائی کے لئے ایک حریف لازمی طور پر ضروری ہوتا ہے۔

مگر یہ تمام باتیں محض اوہام اور مفروضات کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بے حقیقت ہونے کا ایک

ثبوت یہ ہے کہ آج بھی مغربی ملکوں کے ہزاروں لوگ مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی عظمت کو قائم کرنے والی بہترین کتابیں اہل مغرب ہی نے لکھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو، راقم الحروف کی کتاب فکر اسلامی، صفحہ ۷۰-۷۲)

مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں کچھ مغربی حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جو پروپگنڈا کیا گیا ہے۔ اور پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا میں اسلام کی تصویر بگاڑنے کی جو کوشش کی گئی ہے، اس کا سب سے بہتر اور مؤثر جواب بھی بعض مغربی مصنفین ہی نے فراہم کیا ہے۔ ان میں سے ایک قابل تذکرہ کتاب ایک برطانی خاتون کی ہے جو پہلی بار ۱۹۹۱ میں لندن سے چھپی ہے۔ ۲۸۰ صفحہ کی یہ قیمتی کتاب حسب ذیل ہے:

Muhammad:
A Western Attempt to Understand Islam
Karen Armstrong
Victor Gollancz Ltd., London

حال ہی میں لندن سے ایک اور کتاب چھپی ہے۔ اس کتاب نے اس افسانہ کا خاتمہ کر دیا ہے کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد مغرب نے اسلام کو اپنے عدو کے روپ میں پیش کرنا شروع کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس افسانہ کی شہرت مغربی دنیا سے زیادہ مسلم دنیا میں ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایسے لوگوں کے لئے انتہائی قابل مطالعہ کتاب ہے جو عداوت کے مفروضہ میں یقین رکھے ہوئے ہیں:

Islam & the Myth of Confrontation
by Fred Halliday

یہ دوسری کتاب عربی زبان میں بھی ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہے۔ اور اس کا نام یہ ہے:
الاسلام و اسطورۃ المواجھۃ۔

سلمان رشدی کے واقعہ کے ذریعہ زیادہ اہم چیز جو بے نقاب ہوئی ہے وہ خود مسلمانوں کے علماء اور دانشوروں کی ایک مہلک کمزوری ہے۔ وہ ہے ـــــ ایک خبر کو سن کر فوراً اس کے اوپر بھڑک اٹھنا اور بلا تحقیق اس کے پیچھے دوڑ پڑنا۔ اس قسم کی عاجلانہ

کارروائی ہمیشہ آخر کار خود اپنی رسوائی کا باعث ہوتی ہے۔ اور وہی اس معاملہ میں ہمارے ساتھ پیش آیا ہے۔

اس قسم کا ردعمل بلاشبہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ قرآن وحدیث میں واضح طور پر اہل اسلام کو ایسے عاجلانہ ردعمل سے منع کر دیا گیا ہے۔

قرآن کی ۴۹ ویں سورہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ پر نادانی سے جا پڑو، پھر تمہیں اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔ (الحجرات ۶)

برائی کے خلاف عاجلانہ اقدام خدائی اسکیم کے خلاف ہے، چنانچہ اس کا نتیجہ اکثر حالات میں ندامت ہوتا ہے۔ سلمان رشدی کے معاملہ میں تقریباً پوری ملت اسی نادانی سے دوچار ہوئی ہے۔ اس معاملہ کی خبر جب میڈیا کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آئی تو تحقیق اور مشورہ کے بغیر ہر ایک لفظی جہاد کے میدان میں کود پڑا۔ مگر آخر میں ہر ایک کو ندامت کا شکار ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

۱۔ ہندستان کے علماء، مثلاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)، مولانا ابواللیث اصلاحی (سابق امیر جماعت اسلامی ہند) نے قتل کے فتوے کی حمایت میں فوراً اخبار میں بیان دے دیا۔ بعد کو حالات نے بتایا کہ ان کی حمایت درست نہ تھی۔ چنانچہ دونوں نے اپنے سابقہ بیان میں تعدیل کی اور دوسرا بیان اخبار میں شائع کیا۔ (ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب کا صفحہ ۵۹)

۲۔ اس واقعہ کے ابتدائی زمانہ میں مکہ میں مسلم ذمہ داروں کی ایک میٹنگ رابطۃ العالم الاسلامی کے تحت ہوئی۔ اس میٹنگ میں ان ذمہ داروں نے اعلان کیا کہ سلمان رشدی مرتد ہے، اور اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ (ملاحظہ ہو، زیر نظر کتاب کا صفحہ ۲۹)

اس کے بعد ریاض میں تنظیم اسلامی کانفرنس (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں ۲۶ مسلم ملکوں کے اعلیٰ ذمہ دار شریک ہوئے۔ انھوں نے بلا اعلان مذکورہ بیان کی تصحیح کی اور متفقہ طور پر اس کے بالکل برعکس بیان دیا۔ انھوں نے آیت اللہ خمینی کے فتوے

کو کلی طور پر رد کر دیا۔ (ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب، صفحہ ۳۱)

۳۔ مسلم دنیا کی مشہور شخصیت اور سعودی عالم دکتور عبد اللہ عمر نصیف نے ابتداء میں وہی بات کہی جو آیت اللہ خمینی کی حمایت میں عام علماء کہہ رہے تھے۔ یعنی یہ کہ سلمان رشدی اپنی مذکورہ کتاب کی وجہ سے قابل قتل ہے۔ (ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب، صفحہ ۲۹) مگر بعد کو انھیں اس انتہا پسندانہ نظریہ سے رجوع کرنا پڑا۔

دکتور عبد اللہ عمر نصیف ۱۹۹۳ کے آغاز میں روم (اٹلی) گئے۔ وہاں انھوں نے مسیحی پیشوا پوپ جان پال دوم سے ملاقات کی۔ روم میں انھوں نے ایک عالمی ایجنسی ورلڈ نیوز لنک (World News Link) کو ایک انٹرویو دیا۔ انگریزی رپورٹ کے مطابق، اس کا ایک سوال وجواب یہ تھا:

Q. What is your opinion of the death penalty imposed on the British author Salman Rushdie by Iran's religious leaders.

A. Some people, in emotion, pass these resolutions. I think that today we must promote human rights. The death penalty should be only for criminals who commit the crime of killing people. But otherwise, human rights should be given to everybody. (Newstime, Hyderabad, 17 February, 1993)

سوال: ایران کے مذہبی رہنماؤں نے برطانی مصنف سلمان رشدی کے خلاف موت کی سزا کا فیصلہ دیا ہے۔ اس کے بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے۔

جواب: کچھ لوگ جذباتی طور پر اس قسم کی تجویزیں منظور کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج ہمیں انسانی حقوق کو فروغ دینا چاہئے۔ موت کی سزا کو صرف ان مجرموں کے لئے ہونا چاہئے جو قتل کا جرم کرتے ہیں۔ بصورت دیگر، ہر ایک کو انسانی حقوق دیا جانا ضروری ہے۔

۴۔ خود ایرانی رہنماؤں کا بھی یہی حال ہوا۔ ابتداءً انھوں نے بڑے زور وشور کے ساتھ قتل کی سزا کا اعلان کیا۔ مگر اس کے بعد ساری دنیا میں ان کے خلاف جو ردعمل ہوا اس کی بنا پر وہ اس کے لئے کوئی بھی عملی اقدام نہ کر سکے۔ پھر یہ خبریں آنے لگیں کہ ایرانی

رہنما سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کو واپس لے رہے ہیں۔ آخر کار ۱۲ مارچ ۱۹۹۶ء کو ابوظبی کی ڈیٹ لائن کے ساتھ اخباروں میں اس عنوان کی خبر آگئی کہ ـــــــ ایران رشدی کے خلاف قتل کی سزا کو موقوف کرتا ہے :

Iran drops death sentence on Rushdie

اگلے دن اخباروں نے خوشی کے ساتھ ادارتی نوٹ لکھے کہ سات سال بعد ایران نے اس "غیر مہذب" فتوے کو واپس لے لیا۔ ہندستان ٹائمس (۱۳ مارچ ۱۹۹۶) کے ادارتی نوٹ (End of a fatwa) کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا تھا :

The Iranian decision must be welcomed... for the hope that the twentieth century world would turn a leaf on the medieval practices of burning books and sending their authors to the stake.

ایران کے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے، اس امید میں کہ بیسویں صدی کی دنیا اب قرون وسطیٰ کے ان طریقوں سے نجات پا جائے گی جبکہ کتابوں کو جلایا جاتا تھا اور ان کے مصنفین کو زندہ نذر آتش کر دیا جاتا تھا۔

۵۔ یہی واقعہ وسیع تر سطح پر پوری ملت کے ساتھ پیش آیا۔ سلمان رشدی کی کتاب پر آیت اللہ خمینی کا فتویٰ آنے کے بعد ساری دنیا کا مسلم پریس بیک زبان اس کی تائید پر کھڑا ہو گیا۔ تمام اخبار اور رسالے "مارو، مارو" کی آواز سے گونج اٹھے۔ مگر آج یہ تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ مکمل طور پر خاموش ہیں، جبکہ سلمان رشدی بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔

اگر ان لوگوں کا پچھلا موقف درست تھا تو شرعی طور پر ان کے لئے جائز نہیں کہ سلمان رشدی زندہ موجود ہو اور وہ اس کے معاملہ میں خاموشی اختیار کر لیں۔ انھیں نہ صرف لکھنا اور بولنا چاہئے، بلکہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اپنے اعلان کی عملی تکمیل کرنا چاہئے۔ اور اگر ان پر ان کی غلطی واضح ہو گئی ہے تو ان کا فرض ہے کہ جس طرح پہلے انھوں نے واضح لفظوں میں رشدی کے گردن زدنی ہونے کا اعلان کیا تھا، اب کھلے طور پر اپنی مجرمانہ غلطی کا اعتراف کریں۔ اور جن لوگوں تک انھوں نے اپنی پہلی رائے پہنچائی تھی، اب ان تمام لوگوں تک اپنی دوسری رائے بھی پہنچائیں۔

ان دو کے سوا تیسرا رویہ ـــــ بلا اعلان چپ ہو جانا، موجودہ حالت میں ایک جرم ہے اور سخت اندیشہ ہے کہ اس تیسرے موقف کو اختیار کرنے کے لئے انھیں خدا کے یہاں سخت مواخذہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے بار بار ایسا کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک صورت حال آئی۔ انھوں نے ضروری تحقیق کے بغیر جلد بازی میں ایک انقلابی قدم اٹھا دیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان کا اقدام غلط تھا۔ اس علم کے بعد انھوں نے صرف یہ کیا کہ خاموش ہو کر اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی رہنما کے لئے یہ موقف جائز نہیں۔ اس طرح بزعم خود وہ اپنی تصویر بگڑنے سے بچا لیتا ہے مگر عوام کو ابدی طور پر وہ ہلاکت کے گڑھے میں باقی رہنے دیتا ہے۔ عام لوگ کسی معاملہ کی گہرائی کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اپنے قائد کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ اس لئے جس قائد نے عوام کو پہلی بار غلط راستہ پر دوڑ ایا تھا، اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ غیر مشتبہ انداز میں اپنی غلطی کا اعلان کرے، تاکہ اس کے اتباع معاملہ کی صحیح نوعیت کو سمجھ لیں اور دوبارہ ایسی غلطی میں مبتلا نہ ہوں۔

امتحان کی اس دنیا میں غلطی کرنا جرم نہیں ہے۔ اصل جرم یہ ہے کہ غلطی کرنے کے بعد آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے۔

اُردو

	Rs.
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبرِ انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	45/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دینِ کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	50/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصرِ حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	–
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	30/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
امہات المومنین	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
طلاق اسلام میں	3/-

تاریخ دعوت حق	5/-
مطالعۂ سیرت	12/-
ڈائری جلد اول	80/-
کتاب زندگی	55/-
انوارِ حکمت	–
اقوالِ حکمت	25/-
تعبیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	–
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعبیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	8/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلام	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	12/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
فکر اسلامی	50/-

نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامین اسلام	45/-
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علم کلام	9/-
اسلام کا تعارف	3/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	10/-
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	7/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	4/-
منزل کی طرف	2/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-

ہندی

سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبر اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	10/-
آخری سفر	8/-
اسلام کا پرتیچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھویش	8/-
پوترجیون	8/-
منزل کی اُور	3/-

God Arises	Rs. 95/-
Muhammad: The Prophet or Revolution	85/-
Islam As It Is	55/-
God-Oriented Life	70/-
Religion and Science	45/-
Indian Muslims	65/-
The Way to Find God	20/-
The Teachings of Islam	25/-
The Good Life	20/-
The Garden of Paradise	25/-
The Fire of Hell	25/-
Man Know Thyself!	8/-
Muhammad: The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	25/-
Polygamy and Islam	7/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
Islam: The Voice of Human Nature	30/-
Islam: Creator of the Modern Age	55/-
Woman Between Islam and Western Society	95/-
Presenting the Qur'an	165/-
Woman in Islamic Shari'ah	65/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
Treasury of the Qur'an	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-

آڈیو کیسٹ

حقیقتِ ایمان	25/-
حقیقتِ نماز	25/-
حقیقتِ روزہ	25/-
حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
حقیقتِ حج	25/-
سنتِ رسولؐ	25/-
میدانِ عمل	25/-
رسول اللہؐ کا طریقِ کار	25/-
اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
اسلامی اخلاق	25/-
اتحادِ ملت	25/-
تعبیرِ ملت	25/-
نصیحتِ لقمان	25/-

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel. 4611128, Fax 4697333